تصوّف! ایک تعارف

(تصوّف پر چند قیمتی تحریروں کا مجموعہ)

مؤلف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ

(م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)

(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو، یوپی)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

مکتبہ ضیاء الکتب

خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)

تصوّف ایک تعارف (تصوّف پر چند قیمتی تحریروں کا مجموعہ)
حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ
مرتب مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

تصوف! ایک تعارف

(تصوف پر چند قیمتی تحریروں کا مجموعہ)

مولف

حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمیؒ (م: ۲۸؍ستمبر ۲۰۱۳ء)
(بانی: مدرسہ سراج العلوم، چھپرہ، ضلع مئو یوپی)

مرتب

مولانا ضیاء الحق خیرآبادی

ناشر

مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
پن کوڈ:276403 موبائل:923532757

تفصیلات

نام کتاب : تصوف! ایک تعارف
مؤلف : حضرت مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی علیہ الرحمہ
مرتب : مولانا ضیاء الحق خیرآبادی
صفحات : 144
طبع اول : ۲۰۰۸ء
طبع دوم : ۲۰۱۵ء
ناشر : مکتبہ ضیاء الکتب، خیرآباد، ضلع مئو (یوپی)
قیمت : 80/=

ای میل: **zeyaulhaquekbd@gmail.com**

ملنے کے پتے

☆ فرید بک ڈپو پٹودی ہاؤس، دریا گنج، نئی دہلی ۲
☆ کتب خانہ نعیمیہ دیوبند
☆ مدرسہ سراج العلوم چھپرہ ضلع مئو یوپی 9235327576
☆ مکتبہ الفہیم صدر چوک مئوناتھ بھنجن 9236761926
☆ مولانا محمد خالد قاسمی مکتبہ دارارقم، اسلام آباد (ڈکہا) جون پور 9554983430

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض مرتب

مشہور سیاسی رہنما، رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی علیہ الرحمہ سے سوال کیا کہ:

تصوف کیا ہے؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

حضرت شیخ الحدیث علیہ الرحمہ نے اس کا نہایت مختصر جواب دیا، مگر اسی میں سارے تصوف کا خلاصہ آ گیا۔ فرمایا:

تصوف صرف تصحیح نیت کا نام ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتداء **إنما الاعمال بالنيات** سے ہوتی ہے، اور انتہا **أن تعبد الله كأنك تراه** پر ہوتی ہے، یہ سارے تصوف کا منتہا ہے، اسی کو نسبت کہتے ہیں، اسی کو حضوری کہتے ہیں۔

سارے پاپڑ اسی کیلئے بیلے جاتے ہیں، ذکر بالجہر بھی اسی واسطے ہے، مجاہدہ و مراقبہ بھی اسی لئے ہے، اور اللہ جل شانہٗ اپنے لطف و کرم سے کسی کو اور طرح سے یہ دولت عطا کر دے تو، تو اس کو کہیں کی بھی ضرورت نہیں۔ (آپ بیتی ج:۱ ص:۷۴ ملخصاً)

یہ ہے تصوف کی حقیقت اور اس کا خلاصہ، اس کی اہمیت و ضرورت سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، مگر عہد حاضر میں بے عمل اور ناکارہ افراد کا ایک ہجوم ہے جسے مسلسل یہ اصرار ہے کہ یہ ایک غیر اسلامی فعل ہے، تاکہ اس سے اس کی بے عملی اور ناکارگی کیلئے سند جواز فراہم ہو جائے، اس لئے آسان نسخہ یہی ہے کہ جو عمل نفس پر دشوار اور گراں ہو اس کا انکار ہی کر دیا جائے تاکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے سوال ہی ختم ہو جائے۔

یہ فکر و خیال جو عین نفس کے موافق ہے، بہت تیزی سے فروغ پا رہا ہے، اس صورتحال کو دیکھ کر بار بار دل میں یہ خیال آتا رہا کہ ایک ایسا رسالہ شائع کیا جائے، جو تصوف

کے صحیح تعارف، اس کی حقیقت اور اصحاب تصوف کی اہمیت وضرورت پر مشتمل ہو۔ اس کے لئے میں نے حضرت الاستاذ مولانا اعجاز احمد صاحب اعظمی مدظلہ کے پانچ مضامین کا انتخاب کیا، جو اس سلسلہ میں نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔

ان میں سے پہلا مضمون ‘‘تصوف کی حقیقت اور تصوف واصحاب تصوف کی اہمیت وضرورت’’ ہے۔ یہ مضمون ‘‘تذکرۂ شیخ ہالیجوی’’...... یہ سندھ کے معروف شیخ طریقت، عارف باللہ حضرت مولانا حماداللہ صاحب ہالیجوی کی سوانح حیات ہے...... سے لیا گیا ہے۔ دوسرا مضمون ‘‘متاعِ گمشدہ’’ ہے، جو مجلّہ ‘‘المآثر’’ مئو میں شائع ہوا تھا، اس میں منکرین تصوف کے ساتھ ساتھ ان حامیان تصوف کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جنھوں نے تصوف کے نام پر تصوف کے علاوہ اور بھی کچھ بہت پھیلا رکھا ہے۔ تیسرا مضمون جو اس سلسلہ کا سب سے اہم اور مفصل مضمون ہے ‘‘تصوف کیا ہے؟’’ یہ ماہنامہ دارالعلوم کے الاحسان نمبر میں (‘‘تصوف ایک تعارف’’ کے عنوان سے) شائع ہو چکا ہے، اس کا تفصیلی تعارف اور شان نزول حضرت الاستاذ نے اپنی تمہیدی تحریر میں کر دیا ہے۔ چوتھا مضمون ‘‘علماء مظاہر اور تصوف وسلوک’’ یہ مضمون ماہنامہ مظاہر علوم کے خاص نمبر کے لئے تحریر کیا گیا تھا، اور اس میں شائع ہوا۔ پانچواں مضمون مجلّہ ‘‘المآثر’’ کا ایک اداریہ ہے۔

باری تعالیٰ اس حقیر کاوش کو قبول فرمائیں، اور مؤلف مدظلہ کو اجرِ جزیل عطا فرمائیں، اور اسے امت کے لئے نافع ومفید بنائیں۔ آمین

ضیاء الحق خیرآبادی

مدیر ماہنامہ ضیاء الاسلام
مدرس مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، ضلع اعظم گڈھ
۲۹؍صفر المظفر ۱۴۲۹ھ مطابق ۸؍مارچ ۲۰۰۸ء

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

۱۹۹۳ء کا کوئی مہینہ تھا، غالباً اپریل! اس خاکسار کی حاضری دارالعلوم دیوبند میں ہوئی، رسالہ دارالعلوم کے فاضل مدیر مولانا حبیب الرحمٰن قاسمی سے گفتگو ہو رہی تھی، گفتگو کے دوران یہ بات آئی کہ تصوف وسلوک اور احسان وطریقت جو علماء دیوبند کے خصائص وامتیازات میں ہے، جن حضرات نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی، اور جن بزرگوں کے فیض تعلیم اور فیضان صحبت ونظر سے یہ اصحاب باکمال اور مقناطیسی شخصیات کے مالک ہوئے، اور پھر دوسرے لوگ ان کی خدمت میں رہ کر آفتاب وماہتاب بنے، جن کے نورِ باطن اور حرارتِ ایمان سے، امت مسلمہ کے قلوب اب تک روشن اور گرم ہیں، یہ سب حضرات شریعت وطریقت کے جامع، تصوف وسلوک کے شناور اور جذب وحال کے ذوق آشنا تھے۔

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ اور ان کے اولاد واحفاد، پھر اسی سلسلہ کی دو عظیم الشان شخصیتیں حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور حضرت مرزا مظہر جان جاناں، اور ان دونوں کے سلسلے، ان کے بعد مجاہد کبیر امیر المومنین حضرت سید احمد شہید اور ان کے دو بڑے رفقاء حضرت شاہ محمد اسمٰعیل شہید اور حضرت مولانا عبدالحی صاحب اور ان کا پورا قافلہ، ان سب حضرات کی بنیادی دولت اور ان کا اصل سرمایہ شریعت وطریقت سے عبارت تھا، پھر یہ سلسلہ منتقل ہوتا ہوا مدرسہ دیوبند کے بانیوں حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی تک آیا، ان حضرات کا جذبۂ عمل، اخلاص وللّٰہیت اور اسلام اور مسلمانوں کے حق میں بے قراری اور تڑپ، اگر انصاف کیا جائے تو اس کی بنیاد میں یہی تصوف وسلوک کا جذبہ کارفرما نظر آئے گا۔

پھر جو لوگ دارالعلوم دیوبند سے وابستہ ہوئے، اور اس چشمۂ شیریں سے سیراب

ہو کر نکلے اور دوسروں کو بھی سیراب کیا، اور تمام ہندوستان میں پھیل کر دین کی بے لوث خدمت کی، وہ انھیں حضرات سے بعنوان تصوف مربوط ومنسلک ہوئے۔ اکثر لوگ حضرت گنگوہی اور حضرت نانوتوی سے بیعت ہوئے، بعض اکابر ان دونوں کے شیخ ومرشد حضرت حاجی امداد اللہ صاحب علیہ الرحمہ کے دامن فیض سے براہ راست وابستہ ہوئے، جو مصالح کے تحت ہندوستان چھوڑ کر بیت اللہ شریف کے زیر سایہ مقیم تھے، ان میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جو تصوف وسلوک کا منکر ہو، منکر تو خیر دور کی بات ہے، کوئی بھی ایسا نہیں ہے، جس کو تصوف سے اجنبیت ہو، اب بھی ان بزرگوں کا سلسلۂ فیض ان کے خلفاء ومتوسلین کے واسطے سے چل رہا ہے، مگر اب ایک اور طرح کی ہوا چلنے لگی ہے، خود دارالعلوم دیوبند کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ حضرات میں ایسے لوگ ملتے ہیں، جو تصوف کو اجنبیت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس سے بدکتے ہیں، دوسروں کو بدکاتے ہیں، یا کم از کم تصوف کی مخالف تحریکوں، غیر مقلدیت یا جماعت اسلامی سے متاثر ہیں۔ ذکر آیا کہ یہ بات تشویشناک ہے، یہ رُجحان تو دارالعلوم دیوبند اور اس کے بزرگوں کا اصل سرمایہ ہی کھو دے گا، ستم ظریفوں نے زبان اور قلم کا زور لگا کر یہ پروپیگنڈہ کر رکھا ہے کہ تصوف شریعت کے بالمقابل کوئی دوسری تحریک ہے، جو کہیں کہیں شریعت سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے، اور اکثر جگہ شریعت سے جدا رہتی ہے، لیکن یہ بات اتنی ہی غلط ہے، جتنی یہ غلط ہے کہ علماء دیوبند معاذ اللہ شانِ رسالت میں گستاخ ہیں، جس کا پروپیگنڈہ بدعات وخرافیات کی تحریک عرصہ سے کر رہی ہے۔

تصوف، اس کیفیت احسانی کے لئے مشق وتمرین کا نام ہے، جس کا تذکرہ اس مشہور حدیث میں ہے، جو اہل علم کے درمیان حدیث جبرئیل کے نام سے معروف ہے، یہ دین کے بنیادی مقصد کے حصول کی جدو جہد کا نام ہے، اس سے بدکنا دین سے بدکنا ہے۔ دین کا یہ شعبہ جتنا اجنبی اور کمزور ہوتا جا رہا ہے، امت مسلمہ کے ایمان واحوال میں اتنا ہی ضعف واضمحلال آتا جا رہا ہے، ایمان واسلام کے ظاہری شعبے جس درجے میں موجود ہیں۔ وہ ہیں۔ لیکن ان میں روح کا فقدان بیّن طور سے محسوس ہو رہا ہے، اور اسی کا اثر ہے کہ ظاہری

شعبے بھی سمٹتے جارہے ہیں۔

یہ ایک تشویشناک صورتحال ہے، جو ہماری گفتگو میں زیر بحث آئی، اور یہ بھی ذکر آیا کہ جب کوئی عمل ختم ہوتا ہے، تو اس کا علم بھی رُخصت ہو جاتا ہے، تصوف درحقیقت ایک عملی چیز ہے، مگر ہر عمل کے لئے علم لازم ہے، تو اگر عمل رُخصت ہو رہا ہے تو اندیشہ ہے کہ علم بھی جا تا رہے، پھر اس سے وحشت بڑھ جائے تو دین وملت کا نقصان عظیم ہوگا۔

مولانا قاسمی کو خیال ہوا کہ دارالعلوم کا ایک خصوصی شمارہ اسی موضوع پر شائع کیا جائے، انھوں نے مجھے مکلّف بنایا کہ ایک مفصل مضمون لکھوں۔ میں نے باوجود نااہلی کے حامی بھر لی۔

اسی سفر میں، میں حیدرآباد گیا۔ وہاں دس دن دارالعلوم حیدرآباد میں قیام رہا، فرصت کے اوقات ملے اور میں نے ایک مفصل مقالہ ''تصوف ایک تعارف'' کے عنوان سے لکھا۔

مولانا نے دارالعلوم کا الاحسان نمبر سال بھر بعد شائع کیا، اس میں یہ مقالہ چھپا۔ اس کے بعد مختلف مواقع پر تصوف وسلوک اور اصحاب تصوف کے متعلق، کبھی ضمناً، کبھی مستقلاً کچھ کچھ لکھتا رہا، کیونکہ زمانہ کی ہوا کچھ ایسی چلی ہے کہ غریب تصوف کا ذکر کیا، پورے دین ہی کو مسخ وتحریف کا نشانہ کچھ لوگ بنائے ہوئے ہیں، دنیاداری اور نفسانیت کے زور نے دین کی پابندیوں کو گراں بنا دیا ہے۔ پڑھے لکھے دیندار لوگ، جو علماء کی صف میں شمار کئے جاتے ہیں، وہ تصوف کو انہونی چیز سمجھ رہے ہیں، لیکن مسلمانوں کے قلب میں نورِ ایمان کی وجہ سے جو گداز اور صلاحیت پائی جاتی ہے، امید ہے کہ اس کو متوجہ کیا جائے، تو اچھے نتائج ظاہر ہوں گے۔

ویسے موجودہ حالات میں تصوف ایک پِتّہ ماری کا کام ہے، اس میں خلوص سے لگنا بڑا حوصلہ چاہتا ہے۔

اس جگہ ہم ماضی قریب کے ایک بلند پایہ عالم ومرشد اور صاحب نسبت شیخ مصلح

الامت عارف باللہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کا کلام نقل کرتے ہیں، اس سے ہمارے موضوع پر خوب روشنی پڑتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> چونکہ ظاہر دین کو اختیار کرنا آسان ہے، اس لئے اس کو تو اختیار کر لیتے ہیں، اور باطنی اعمال کا اختیار کرنا اور اخلاق کی اصلاح کرنا چونکہ مشکل معلوم ہوتا ہے، نفس کو مارنا پڑتا ہے، اور اس سے اپنے آپ کو قاصر پاتے ہیں، اسلئے باطن کو ہاتھ ہی نہیں لگاتے، بلکہ اس کی طرف آتے ہی نہیں۔
>
> اس کام کے لئے آدمی کو عالی ہمت اور بلند حوصلہ ہونے کی ضرورت ہے، دنیا کو حاصل کر لینا اور صرف ظاہری اعمال کو اختیار کر لینا عالی ہمتی نہیں، بلکہ عالی ہمتی یہ ہے کہ تمام تعلقات غیر ضروریہ کو قطع کر کے اللہ تعالیٰ سے رشتہ جوڑا جائے، اور نسبت مع اللہ حاصل کی جائے، مگر لوگوں کے لئے تعلقات کا ترک کرنا موت ہے، اس لئے نہ اس کو ترک کرتے ہیں، اور نہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا ہوتا ہے، یہ لوگ اللہ تعالیٰ سے تو صبر کر لیتے ہیں، مگر ان علائق سے صبر نہیں کر پاتے، إنا للہ وإنا إلیہ راجعون، فیاحسرتاہ واویلاہ، (مجموعہ تالیفات مصلح الامت، ج:۴، ص:۱۰۱)

عزیز محترم مولانا ضیاء الحق صاحب خیرآبادی سلّمہٗ کا ارادہ ہوا کہ میری وہ تحریریں، جو اس موضوع پر ہیں، انھیں کتابی شکل دے دی جائے، چنانچہ انھوں نے پانچ مضامین کا یہ مجموعہ مرتب کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے نافع بنائیں، اور مرتب موصوف کو جزائے خیر عطا فرمائیں۔

اعجاز احمد اعظمی
(صدر المدرسین مدرسہ شیخ الاسلام، شیخوپور، اعظم گڈھ)
۲۹ / صفر المظفر ۱۴۲۹ھ مطابق ۸ / مارچ ۲۰۰۸ء

☆☆☆☆☆

تصوف کی حقیقت

اور تصوف و اصحاب تصوف کی اہمیت وضرورت

تصوف وسلوک کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ شریعت کے احکام جن کے سامنے سر جھکانے کا نام اسلام ہے اور ان کی تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ اسی اسلام اور ایمان میں قلبی محبت اور ہمہ دم استحضار شامل ہو جائے اور شرعی احکام جنہیں احکام تکلیفیہ کے عنوان سے فقہاء وعلماء تعبیر کرتے ہیں۔ ان سے تکلیف کا مادہ ختم ہو کر انسان کا طبعی اور دلی تقاضا اور حال بن جائے۔ جب یہ کیفیت انسان کے دل میں پیدا ہو جاتی ہے تو اس کی تمام عبادات واعمال صالحہ بلکہ اس کی پوری زندگی اسی کیفیت کے زیر اثر آ جاتی ہے، اسی کیفیت قلبی کا نام رسول اللہ ﷺ نے حدیث جبریل میں احسان رکھا ہے۔

یہی احسان پورے دین کا مغز اور خلاصہ ہے۔ اس کے حاصل ہونے کے بعد انسان کو خدا کا خصوصی قرب نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ ولایت خاصہ مخصوص لوگوں کا نصیب ہے۔ شریعت اور طریقت کے اس اعتباری فرق کو اکبر مرحوم نے اپنے مخصوص انداز میں بہت خوب ظاہر کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

"شریعت سر جھکانا ہے اور طریقت دل لگانا ہے"

سر تو نہ جانے کتنوں کا جھکا رہتا ہے لیکن دل بھی لگا ہو، یہ خال خال ہوتا ہے۔ جھکا ہوا سر کبھی خارجی ترغیب وتحریض کے باعث اٹھ بھی جاتا ہے، بغاوت بھی کر بیٹھتا ہے پابندی احکام میں کلفت بھی محسوس کرتا ہے، راہ فرار بھی سوچنے لگتا ہے لیکن جب دل لگ جاتا ہے تو کلفت کیسی ہر ہر حکم میں لذت وحلاوت کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ راہ فرار سوچنا کیسا؟ اب تو اس کا یہ حال ہوتا ہے کہ ع

''اسیرت نخواہد رہائی ز بند''
تیرے گرفتار کو رہائی کی کوئی تمنا نہیں۔

غرض احکام الٰہیہ کی پابندی اور ان کی ادائیگی دل کی دوا اور روح کی غذا بن جاتی ہے۔

پہلے جس کام کو آدمی بجبر و تکلف انجام دیتا تھا۔ اب اس کو کئے بغیر چین نہیں پڑتا۔ اس کی محسوس مثال یہ ہے کہ طفل گریز پا کو اولاً زبردستی مکتب میں لاتے ہیں، وہ بھاگتا ہے، روتا چلاتا ہے، پاؤں پٹختا ہے، مگر جب اس کو علم کی حلاوت سے آشنائی ہوتی ہے تو علم اس کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ علم اس کے رگ و ریشہ میں سما جاتا ہے۔ اگر اسے کوئی علم سے اور علمی مشاغل سے الگ کرنا چاہے تو اسے موت نظر آنے لگتی ہے کیونکہ علم کی لذت اس کے قلب و روح میں اتر گئی ہے، یہ مرتبۂ احسان کی مثال ہے۔

اسی احسان کو حاصل کرنے کی کوشش اور اس کی جستجو کا نام تصوف ہے۔ تصوف شریعت کا خادم ہے، تصوف سر جھکانے کی کیفیت کو ترقی دے کر دل لگانے کی منزل تک پہونچنے کی جان توڑ جدوجہد کا نام ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ آدمی کو مرتبہ احسان حاصل ہو جائے۔ لوگ خوامخواہ تصوف کے نام سے بھڑکتے اور چڑھتے ہیں، اس عملی جدوجہد کے نتیجہ میں سیکڑوں، ہزاروں افراد کیفیت احسانی سے سرشار ہوتے تھے۔ آج ستم ظریفوں نے اس سے بھڑکا بھڑکا کر ان لوگوں کو بھی احسان کی لذت سے محروم کر دیا ہے جن کی فطرتیں سلیم اور جن کی طبیعتیں احسان کی طالب و جویا ہیں۔

ایک زمانہ تھا کہ مسجدیں چھوٹی، کچی، معمولی ہوتی تھیں۔ مگر ان میں نماز پڑھنے والوں کے سجدوں سے محراب و منبر کو وجد آجاتا تھا اور آج ہے کہ مسجدیں عالیشان، منارے بلند اور صحن مسجد خوب کشادہ ہے لیکن نمازیوں کے دل سونے، سجدے بے روح اور چہرے بے نور ہیں۔

بات یہ ہے کہ کیفیت احسان کے حصول و جستجو کے طریقوں کو اپنے وہمی خیالات کے زیر اثر **عمل بالحدیث** کی نمائش کرنے والوں نے بدعت بدعت کی پکار سے محو کر ڈالا

ہے۔ پھر جتنے قصور وار یہ ہیں، ان سے کم قصور وار وہ بھی نہیں ہیں جو تصوف کے نام پر ہر خرافات کو مستحسن، ہر بدعت کو واجب قرار دے کر تصوف کی غلط نمائندگی کرتے ہیں۔ خیر یہ تو ایک لمبی داستان ہے اور الگ موضوع ہے۔

مجھے یہ عرض کرنا تھا کہ جس طرح ظاہری احکام شرع کی بجا آوری ضروری ہے لیکن انہیں روبہ عمل لانے کے لئے کسی خاص طریقے کی تحدید نہیں کی گئی ہے۔ بس کچھ اصولی باتیں طے کردی گئی ہیں۔ کچھ جائز و ناجائز کی حد بندی کردی گئی ہے۔ کچھ سنن و مستحبات کے دائرے بنا دیئے گئے ہیں۔ انہیں بنیادی اصولوں اور انہیں حدود و دوائر میں رہ کر انسان اپنے زمانے اور ماحول کے مطابق احکام شرع کو بجالانے کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرسکتا ہے۔ مثلاً جہاد کرنا ایک حکم شرع ہے، پہلے اس کے لئے تیر و تفنگ شمشیر و سناں، گھوڑے اور اونٹ کام میں لائے جاتے تھے۔ اب ان کے بجائے بندوق، توپ، ٹینک میزائل، ہوائی جہاز اور دوسرے جدید ذرائع استعمال ہوتے ہیں۔

تو کیا کوئی ہوش و حواس والا یہ کہہ سکتا ہے کہ تلوار اور نیزے وغیرہ منصوص ہیں۔ اس لئے وہ مسنون ہیں۔ اور یہ جدید ذرائع غیر مسنون ہیں اس لئے یہ بدعت ہیں۔ اسی طرح یہ سمجھنا چاہئے کہ دل لگانے (یعنی مرتبہ احسان) کے لئے جائز تدبیریں اختیار کی جاسکتی ہیں۔ اس میں منصوص اور غیر منصوص کو موضوع مجادلہ بنانا ذہنی اور علمی افلاس کی دلیل ہے۔ بس اس میں بھی ان حدود و قیود کی رعایت ضروری ہوگی جنہیں شریعت نے بطور قواعد کلیہ کے متعین کردیا ہے۔

ہر زمانے میں بزرگوں نے، اس فن کے ماہرین و حذاق نے، اپنے اجتہاد و الہام، فراست و روشن ضمیری اور اپنے تجربوں سے مرتبہ احسان کے حصول کے لئے کچھ طریقے اور کچھ تدبیریں متعین کی ہیں۔ ان طریقوں میں جن کا شیوع برنگ عموم ہوا، انہیں سلاسل تصوف کہا جانے لگا۔ یہ سلسلے متعدد ہیں اور ایمان والوں نے ان سے خوب نفع حاصل کیا، مگر چار بزرگوں کے سلسلے اس قوت و شوکت کے ساتھ جاری ہوئے کہ انھوں نے مستقل

خانوادوں کی شکل اختیار کرلی اور ہر زمانے میں ان کے اندر اتنے صاحبان کمال ہوئے کہ وہ اب تک زندہ وتابندہ ہیں۔

ان سلسلوں میں جب کبھی مقصدی اعتبار سے ضعف واضمحلال آیا تو اللہ تعالی نے کسی ایسی طاقتور شخصیت کو اٹھایا کہ اس کے نفس گرم کی تاثیر سے عرصہ دراز تک ماحول گرم اور متحرک رہا۔ گوکہ ان سلسلون کے بزرگوں نے ہر دور میں اپنے اپنے احوال وظروف کے لحاظ سے جزوی طور پر تغیر وتبدل کا عمل جاری رکھا ہے، جمود کہیں نہیں رہا۔ تاہم بنیادی قواعد ہر ایک کے الگ الگ ہیں اور وہ اصولی طور پر باقی اور محفوظ ہیں، بالکل ایسے ہی جیسے دبستان فقہ میں چار مذاہب ہیں اور ان کے بنیادی اصول وقواعد ہیں۔ انہیں باقی رکھتے ہوئے جزئی احکام و مسائل میں بسا اوقات اخذ ورد کا سلسلہ چلتا رہتا ہے، یہ چاروں فقہی مذاہب اپنے اپنے طور پر احکام شرع کی تصحیح وتشکیل میں صاحب شریعت کی منشاء کو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ چاروں مذاہب دینی احکام کو اللہ اور اس کے رسول کی منشاء اور ان کے فرمان کے مطابق ادا کرنے کی کدوکاوش کرتے ہیں۔ اسی طرح چاروں سلاسل تصوف مرتبہ احسان کو حاصل کرنے کی جدوجہد اور سعی ومجاہدہ کا نام ہے۔ (۱)

رات کے عبادت گزار اور دن کے شہ سوار:

یہ اصحاب تصوف ہیں جو کبھی رونق سجادہ نظر آتے ہیں اور کبھی میدان جہاد میں سربکف دکھائی دیتے ہیں۔ کبھی مریدوں اور معتقدوں کے حلقے میں پیرومرشد کی صورت میں

---

(۱) چار بزرگ جن کی نسبت سے یہ چار سلسلے رائج ہیں امت کی برگزیدہ شخصیات ہیں۔ آج بے دینی اور رائے کی آزادی نے، جسے حدیث نبوی میں ''اعجاب کل ذی رأی برایہ'' سے تعبیر کیا گیا ہے، ان کی اہمیت کو گھٹانے کی خواہ کتنی ہی کوشش کی ہو مگر انشاء اللہ، اللہ کے حضور ان کی سعی مشکور ہوگی اور ان کی کھال اور گوشت سے الجھنے والے اپنے اعمال بد کا انجام دیکھ لیں گے، یہ حضرات ذیل میں ذکر کئے جاتے ہیں:-

(۱) سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ، ان کی طرف سلسلہ قادریہ منسوب ہے۔

(۲) سیدنا خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ علیہ، ان کی ذات والاصفات کی جانب سلسلہ چشتیہ منسوب ہے۔

(۳) سیدنا خواجہ بہاؤالدین نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ، سلسلہ نقشبندیہ کا تعلق انہی سے ہے۔

(۴) سیدنا شیخ شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمۃ، یہ سلسلہ سہروردیہ کی بنیاد ہیں۔

دینی رہنمائی کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور کبھی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے مبتلائے مشقت نظر آتے ہیں۔

ستم ظریفوں کی ایک ٹولی نے تصوف وسلوک پر تعطل وبیکاری کا الزام رکھا ہے۔ کسی نے اس پر چنیا بیگم کی پھبتی کسی ہے۔ زندگی اور جہاد زندگی سے اس کو فرار سے تعبیر کیا ہے کسی نے وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کے بالمقابل خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات قرار دیا ہے۔ کسی نے انہیں سر بجیب دیکھا تو بدگمانی قائم کرلی کہ یہ کبھی سر بکف ہو ہی نہیں سکتے۔ معتقدوں کو کبھی دست بوسی کرتے دیکھا تو چیخ اٹھے کہ یہ کبھی دار ورسن کو چوم ہی نہیں سکتے۔

لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ یہ لوگ تاریخ کے آئینے سے نظریں چراتے ہیں۔ جو انہیں نمایاں طور پر دکھاتا ہے کہ اگر دین کے نام پر کسی گروہ نے جان کی بازی لگائی ہے اور جہاد کے میدان میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہایا ہے تو زیادہ تر یہی صوفیاء کا مقدس گروہ رہا ہے۔ جو کبھی ...... خاک کی آغوش میں تسبیح ومناجات میں مشغول رہتے ہیں۔ تو دوسرے وقت وہی وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل کا عمل بھی جاری کرتے ہیں۔ کم از کم ہندوستان میں ہی حضرت مجدد الف ثانی سے لے کر حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی اور حضرت مولانا محمد الیاس صاحب تک کو دیکھ لیں۔

مجدد صاحب اور ان کے عالی مقام صاحبزادگان اور ان کے اخلاف واحفاد پھر شاہ ولی اللہ الدہلوی اور ان کے نامور فرزندان گرامی اور حفید رشید مولانا محمد اسماعیل شہید اور شاہ عبد العزیز صاحب کے خلیفہ حضرت سید احمد شہید پھر انکے متوسلین کا سلسلہ اسکے بعد حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی، حضرت حافظ ضامن شہید، حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی اور دوسرے اکابر یہ سب لوگ تصوف وسلوک کے پروردہ اور اسکے لذت آشنا تھے۔ یہ راتیں تسبیح ومناجات میں گزارتے اور دن کو میدان جہاد کے شہ سوار ہوتے۔ آج انہیں کے خون گرم کا فیضان ہے کہ اس ملک میں دین وایمان کی حرارت پھیلی ہوئی ہے۔

ہندوستان کے باہر مہدی سوڈانی کی تحریک، طرابلس میں سنوسیوں کا جہاد، الجزائر میں دینی جدوجہد اور اسکے نتیجے میں طوق وسلاسل اور کشت وخون کی آزمائش! کون نہیں جانتا کہ ان سب کی بنیادوں میں اسی تصوف اور صوفیاء کی روح بھری ہوئی ہے۔ جس کو آج گلے کا پورا زور اور قلم کی پوری طاقت لگا کر مطعون کیا جا رہا ہے۔

ابھی کتنے دنوں کی بات ہے کہ جب کمیونزم کا طلسم ٹوٹا۔ سوویت یونین اس کے نتیجے میں بکھرا اور اسکے بکھرتے ہی دس گیارہ مسلم ریاستیں صفحۂ ہستی پر ابھر آئیں۔

مشہور تھا کہ کمیونزم نے خدا کو حدود روس سے نکال دیا ہے اور خدا کے ماننے والوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ اب وہاں کوئی اسلام کا نام لیوا نہیں رہا۔ ستر سال تک اسلام کی ہر آواز کو دبایا اور مٹایا گیا اور ان زبانوں کو کاٹ ڈالا گیا جن پر اسلام کا نام آیا اور اس گلے کو تراش دیا گیا جس سے ایمان کی آواز نکلی۔ لیکن اچانک یہ کیا ہوا کہ اس طلسم کے ٹوٹتے ہی ایمان واسلام کے متوالوں کی اتنی بڑی تعداد نکل آئی کہ انہیں دس گیارہ ریاستوں کی سربراہی حاصل ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے جناب حبیب الحق صاحب مرحوم پروفیسر ڈربن یونیورسٹی کو، وہ انہیں دنوں اعظم گڑھ دارالمصنفین میں تشریف لائے تھے۔ انہوں نے تعلیم یافتہ طبقہ کے ایک معقول مجمع میں ان ریاستوں کے حالات سنائے اور اخیر میں انہوں نے بتایا کہ اتنی تعداد میں روس کے جور واستبداد کے باوجود اسلام کے ماننے والے باقی کیسے رہ گئے۔ وہ بتا رہے تھے کہ کیسے گھروں کی کال کوٹھریوں میں ہلکے چراغ جلا کر بچوں کو قرآن پڑھایا جاتا تھا۔ جنگلوں، پہاڑوں کی وادیوں اور صحرا کے سناٹے میں کس طرح جیالی مائیں اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کچھ فقیروں اور ملاؤں کے سپرد کر دیتی تھیں کہ وہ انہیں آبادیوں سے دور، تمدن اور تمدن کے جلوؤں سے دور قرآن اور دین کی تعلیم دیں۔ یہ بچے گھر سے نکل جاتے اور پھر برسوں گھر کی دید سے محروم رہتے۔

یہ کہتے کہتے انہوں نے نہایت موثر انداز اور درد بھرے لہجے میں کہا کہ آج کچھ

لوگ انہیں گری نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن یہ غلطی ہے۔ روس میں اسلام کو زندہ رکھنے کا صبر آزما عمل صرف اور صرف صوفیاء کرام نے انجام دیا ہے۔ اس جملے پر انہوں نے نہایت شدت سے زور دیا، یہ انہیں حضرات کی جاں سپاری اور سرفروشی تھی جس نے اسلام کو باقی رکھا۔ انہوں نے اپنے سینے میں یہ چراغ جلائے رکھا۔ اور اس کی روشنی نئی نسلوں میں جو لوگ مل جاتے انکے سینوں تک منتقل کرتے۔ اور یہ کام وہ اپنی جان پر کھیل کر کرتے، روس میں اس سے بڑا کوئی جرم نہ تھا کہ خدا کا نام خدا کیلئے لیا جائے۔

یہ ہیں حضرات صوفیہ جو کرتے بہت کچھ ہیں اور بولتے کچھ نہیں، پروپیگنڈہ اور نمائش کا فن انہیں نہیں آتا۔ اور ان کو مطعون وہ لوگ کرتے ہیں جن کا جاہ و منصب اور دولت وزر کے علاوہ کوئی اور مطمح نظر نہیں۔ وہ اللہ کا، دین کا، رسول کا نام لیتے بھی ہیں تو حصول اقتدار اور جلب زر کیلئے۔ یہ لوگ کرتے کچھ نہیں اور پروپیگنڈہ ساری دنیا میں کر ڈالتے ہیں۔

وَیُحِبُّوْنَ اَنْ یُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ یَفْعَلُوْا، ،

ان کا حال ہے، (یعنی جو کچھ نہیں کیا ہے اس پر اپنی تعریف کے خواہاں ہیں) تو انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کے حق میں ”فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِنَ الْعَذَابِ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ“ وارد ہے یعنی یہ ہرگز نہ سمجھنا کہ وہ عذاب سے بچ جائیں گے ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔

خیر سلسلہ کلام لمبا ہو گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب ناخلف قسم کے لوگ صوفیائے کرام کو ایک طرف سے تختۂ مشق بناتے ہیں۔ تو جی کڑھتا ہے اگر ان کے طعن وطنز کے نشانہ وہ جاہل صوفیہ ہوتے جو صوفیوں کے بھیس میں شیطان کی نیابت کرتے ہیں۔ تب تو خیر کوئی بات نہ ہوتی۔ ہم اس میں ان کے ہم قدم ہوتے مگر یہاں تو ایک طرف سے سب پر تیشہ چلنے لگتا ہے۔

کیا محدثین کی جماعت میں واضعین حدیث کے گھس آنے کی وجہ سے تمام محدثین گردن زدنی قرار پا جائیں گے اگر نہیں تو خدارا بتایا جائے کہ صوفیہ کے لئے اس اصول کو کیوں ترک کر دیا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

متاع گم شدہ

ہمارا یہ دور جس کے شب و روز میں نسل انسانی اپنی زندگی کا سفر منزل بہ منزل طے کر رہی ہے، اس میں جہاں افراد انسانی کا ہجوم بے پایاں، اور آبادیوں اور تعمیرات کا انبوہ گراں ہے، واقعہ یہ ہے کہ زمین پر انسانوں کی اتنی بڑی اور گھنی آبادی پچھلے کسی دور میں نہیں رہی ہے، اور باوجودیکہ دنیا کی حکومتوں نے بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کا ہر جتن کیا ہے، مگر حال یہ ہے کہ ہر روز شرح پیدائش میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا ہے، جہاں آبادی کا یہ حال ہے، وہیں زمین نے اپنے خزانے بھی کھول دئے ہیں، ہر جاندار کے لئے اس کی ضرورت کا ہر سامان وافر مقدار میں بکھرا پڑا ہے اور ان سب کے ساتھ ساتھ اولاد آدم نے تعلیم و تعلم اور علوم کی نشر و اشاعت کا پچھلے ہر دور سے زیادہ اہتمام کیا ہے، تحصیل علم کے ایسے ایسے حیرت انگیز اسباب دور حاضر کی صناعیوں نے انسانوں کے ہاتھوں میں دے دئے ہیں، جن کا پچھلے زمانوں میں کوئی تصور نہیں ہو سکتا تھا، پریس اور طباعت کا مسئلہ تو پرانا ہو چکا ہے، اب ایسی ایسی مشینیں وجود میں آچکی ہیں کہ تھوڑی سی مقدار کے حجم میں ہزاروں کتابیں سما جاتی ہیں، ایک چھوٹا سا کمپیوٹر اور ایک چھوٹی سی، سی ڈی کسی شخص کے پاس ہو تو ایک عظیم الشان کتب خانے کا مالک ہے، تعلیم گاہوں کی وہ کثرت ہے کہ شہر تو شہر ہیں چھوٹے چھوٹے گاؤں اور ہلکی پھلکی آبادیوں میں علم و دانش کی درسگاہیں کھلی ہوئی ہیں، تعلیم حاصل کرنے والوں کو شمار کیا جائے تو تعداد سیکڑوں اور ہزاروں میں نہیں لاکھوں اور کروڑوں میں ہوگی، مدرسے بہت ہیں، کالج ان گنت ہیں، جامعات بے شمار ہیں، مگر تعلیم حاصل کرنے کے خواہش مندوں کی وہ بہتات ہے کہ ہر روز نئی درسگاہیں کھلتی ہیں مگر تنگ دامانی کا احساس کم نہیں ہوتا، مردوں کی الگ تعلیم گاہیں ہیں، عورتوں کی الگ درس گاہیں ہیں، اور سب کھچا کھچ بھری ہوئی، دنیاوی

تعلیم گاہوں کا تو کیا کہنا، دین کے نام پر قائم ہونے والی درس گاہیں بھی ہر ملک میں بکثرت ہیں، دینی تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ بھی بہت ہیں، دینی کتابیں بھی بہت زیادہ شائع ہو رہی ہیں، دینی موضوعات پر لکھنے والے ہر روز تصانیف کا انبار لگائے جا رہے ہیں، قدیم اور نادر علوم دینیہ کے جواہر پارے دم بدم نئی آب و تاب کے ساتھ شائع ہو کر دنیا بھر کے کتب خانوں میں اور علم کے شائقین کے ہاتھوں میں پہنچ رہے ہیں، چھوٹے بڑے مدارس سے فارغ ہو ہو کر مولوی اور عالم کے نام سے کھیپ کی کھیپ نکل رہی ہے، دینی جلسے بکثرت ہوتے ہیں، جن میں علماء اور واعظین کی بھیڑ ہوتی ہے، ہر جلسے کو اچھے خاصے سامعین بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ دین کے نام پر بہت سی جماعتیں، بہت سی انجمنیں، بہت سی پارٹیاں، بہت سی سوسائٹیاں سرگرم عمل ہیں، کہیں اصلاح عمل کی کوشش ہے، کہیں تصحیح عقائد کا ہنگامہ ہے، کسی کی اہل سنت نام پر سرگرمیاں ہیں، کوئی قرآن کا جھنڈا اٹھائے پھرتا ہے، کوئی احادیث پر عمل کرنے کا نعرہ لگاتا ہے۔ غرض جس طرف دیکھئے علم کا نعرہ ہے، اس کی توسیع واشاعت کی سرگرمیاں ہیں۔ اس صورت حال کا تقاضا تو یہ تھا کہ آبادیوں کی آبادیاں علم کی روشنی سے جگمگا اٹھتیں، انسانوں کی انسانیت معراج کمال کو پہنچ جاتی، علم و ہنر کے اثر سے اخلاق بلند کی برکتیں عام ہوتیں، ہر آدمی ایک دوسرے کا ہمدرد و بہی خواہ ہوتا، کیونکہ علم کا یہی تقاضا ہے لیکن کتنی حیرت ناک بات ہے کہ جو کچھ ہونا چاہئے تھا وہ بہت کم موجود ہے، مراکز علم بہت، اور اسباب علم بے شمار، مگر علم کے آثار و نتائج بہت کم، انسانیت کی تعلیم بہت مگر خود انسانیت معدوم، اخلاق حسنہ کی تلقین بہت مگر اخلاق حسنہ کا پتہ نہیں، ایثار و مروت کی تبلیغ بہت مگر خود ایثار و مروت متاع گمشدہ، ع:

اندھیر ہو رہا ہے بجلی کی روشنی میں

ایسا نہیں ہے کہ تضاد واضح نہ ہو، اور ایسا بھی نہیں ہے کہ غور کرنے والے اس تضاد کے اسباب پر غور نہ کرتے ہوں، غور کرتے ہیں، بلکہ غور کرنے کیلئے کانفرنسیں کرتے ہیں، سیمینار منعقد کرتے ہیں، کتابیں لکھتے ہیں، لیکن انجام یہ ہوتا ہے کہ اندھیرا اور بڑھ جاتا ہے۔

بات یہ ہے کہ جو لوگ دنیاوی تعلیم میں سرگرم ہیں، وہ تو اللہ اور رسول کی تعلیمات کی طرف رخ ہی نہیں کرتے، وہ اپنے خود ساختہ خیالات ونظریات میں گم رہتے ہیں، وہ تو جس چیز کا نام علم رکھتے ہیں فی الحقیقت اس سے جہل پھیلتا ہے، اس علم سے انسانیت سنورتی نہیں بگڑتی ہے، ایثار ومروت نہیں خود غرضی اور سرکشی پرورش پاتی ہے، کیونکہ اس کا رشتہ اصل سرچشمہ علم سے کٹا ہوا ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے لیکن حقیقت واقعہ یہ ہے کہ اصل علم وہ ہے جو اللہ نے اپنے پیغمبروں پر نازل فرمایا ہے اور اخیر میں اس سب کا صاف ستھرا اور یقینی مجموعہ نبی آخر الزماں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے دنیائے انسانیت کو ملا، یہی علم حق ہے جسکا رشتہ اس سے کٹا وہ ضلالت ہے، **فماذا بعد الحق الا الضلال**، ہمیں اپنے اس دعوے پر کسی دلیل اور برہان قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ دنیا کی تاریخ اور زمانے بھر کے تجربات نہایت واضح انداز میں اس کی صداقت کو دہراتے رہتے ہیں۔

ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اور جس متاع گم شدہ کی نشان دہی کرنا چاہتے ہیں نیز اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرنا چاہتے ہیں، اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جن کی رسائی اس سرچشمۂ ہدایت تک ہو چکی ہے، جو اس آب زلال سے سعادت اندوز ہو رہے ہیں جن کا موضوع علوم دنیا نہیں علوم دین ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان کے ہاتھوں سے کیا چیز گم ہو گئی ہے جس کے نہ ہونے سے علم کی رونق جاتی رہی، اس نے اپنی تاثیر کھو دی، دلوں میں تازگی باقی نہ رہی، اعمال حسنہ کے برگ وبار مرجھا گئے، اور باوجود اسباب علم کی فراوانی کے جہل بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

سوچنے والے جو چاہیں سوچیں مگر اس حقیقت کو نظر انداز نہ کریں کہ ہادی برحق ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے **الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد كله واذا فسدت فسد الجسد كله الا وهی القلب** خوب سن لو خوب سمجھ لو کہ جسم کے اندر ایک پارۂ گوشت ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا جسم درست ہوتا ہے، اور وہ بگڑتا ہے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے، خوب سنو اور سمجھ لو کہ وہ دل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اس حدیث میں علم طب کے کسی مسئلے کی تشریح نہیں فرمائی ہے بلکہ روحانیت اور تقوی کی بنیاد بتائی ہے، انسانیت

کو سدھارنا ہو، اس کے اندر حسن و جمال پیدا کرنا ہو، اس کو علم وتقوی کے نور سے روشن کرنا ہو تو قلب انسانی پر محنت کرنی ہوگی، اس کو بگاڑ اور فساد سے بچانا ہوگا، انبیاء کی محنت کا میدان یہی رہا ہے، یہ سدھر گیا تو ایک صالح معاشرہ وجود میں آ گیا۔

قلب کا سدھار کس چیز سے ہے اہل علم حضرات پر پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم اس کی طرف اشارہ کر دینا مناسب ہے، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے **ماذئبان جائعان ارسلا فی غنم با فسد لها من حرص المرء علی المال والشرف لدینه** (ترمذی و دارمی) دو بھوکے بھیڑیئے جو بکریوں کے ریوڑ میں چھوڑ دیئے گئے ہوں ان بکریوں کو اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتے جتنا آدمی کے دین کو مال کی اور عزت وجاہ کی ہوس نقصان پہنچاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ دل میں اگر مال وجاہ کی ہوس موجود ہے تو وہ دل تباہ ہے، اور اس کی تباہی سے اسکا دین برباد ہے اور رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ **اول صلاح هذه الامة الیقین والزهد واول فساد ها البخل والامل** (شعب الایمان البیہقی) اس امت کی پہلی نیکی اور بہتری یقین اور زہد ہے اور اس کا پہلا بگاڑ بخل اور امل ہے، بخل کا حاصل مال کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے، اور امل کا مطلب ہے کہ دنیا میں زیادہ سے زیادہ زندہ رہنے کی آرزو۔ جس کا حاصل حب دنیا ہے، ظاہر ہے حب مال ہو یا حب دنیا، ان دونوں کا تعلق دل سے ہے، اور آپ نے فرمایا یہ دونوں اس امت کا پہلا بگاڑ ہے، ایک اور حدیث ملاحظہ ہو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: **ان ا خوف ما اتخوف علی امتی الهوی وطول الامل فاماالهوی فیصد عن الحق وأما طول الامل فینسی الآخرة** مجھے اپنی امت پر سب سے زیادہ اندیشہ ہویٰ اور طول امل سے ہے ہویٰ کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اللہ اور رسول کی ہدایات سے صرف نظر کر کے اپنے نفس کے ذاتی نظریات اور رجحانات پر چلے، اللہ تعالی کا ارشاد ہے **ومن اضل ممن اتبع هواه بغیر هدی من الله**۔ اس سے بڑا گمراہ اور کون ہوگا جو اللہ کی ہدایت سے ہٹ کر اپنے ہویٰ (یعنی ذاتی نظریات) کی پیروی کرے، اور طول امل یہ ہے کہ زندگی اور دنیا کی لمبی لمبی امیدیں باندھے۔

پھر آپ نے دونوں کی خرابیاں بیان فرمائیں، ھویٰ کے بارے میں یہ فرمایا کہ وہ حق بات کے قبول کرنے سے مانع بنتی ہے، یعنی آدمی جب اپنے فکر ونظر میں مست ہوتا ہے تو حق بات کو قبول نہیں کرتا، اور طول امل کی وجہ سے آدمی آخرت سے غافل ہو کر رہ جاتا ہے، وہ دنیا کو اور دنیوی ساز وسامان اور دنیوی جاہ وجلال کو ہی سب کچھ سمجھنے لگتا ہے، پھر اس کا سارا رجحان مادیت کی جانب ہو جاتا ہے اور شریعت کو اور دین وایمان کو اور غیبی حقائق کو بھی مادیت کے تنگ دائرے میں لانے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے بغیر نہ اسے ماننے کیلئے تیار ہوتا ہے اور نہ سمجھنے کیلئے۔

دور حاضر میں مغرب کی لائی ہوئی مادیت نے انسان کو آخرت فراموش بنا دیا ہے اور اس کا اثر اتنا ہمہ گیر ہے کہ اس نظام سے متاثر کتنی وہ جماعتیں بھی ہیں جو بظاہر دین کی خدمت کے لئے قائم ہوئی ہیں، ان کی بھی تسکین ذہنی بجز مادی تعبیرات کے اور کسی چیز سے نہیں ہوتی، وہ محض ثواب آخرت اور عذاب جہنم کی زبان سمجھتی ہی نہیں، قلب ونظر کا یہ وہ بگاڑ ہے جس نے ساری انسانیت کو پلٹ کر رکھ دیا ہے اس بگڑی ہوئی ذہنیت نے ٹھیٹھ دینی تعبیرات ومحاورات میں ایسے معانی شامل کر دئے ہیں جن کو دین وشریعت سے کم اور دنیا اور مادیت سے زیادہ مناسبت ہے۔

اسی حدیث میں آگے یہ الفاظ ملتے ہیں **و ھذہ الدنیا مرتحلة ذاھبة و ھٰذہ الآخرة مرتحلة قادمة** یہ دنیا بھی چل رہی ہے یعنی جارہی ہے اور یہ آخرت بھی چل رہی ہے، یعنی آرہی ہے ایک کی روانگی فنا کی طرف مسلسل ہے، اور ایک کی آمد قریب سے قریب تر ہوتی جارہی ہے۔ دنیا کا ہر روز اسے دور پہنچاتا ہے اور آخرت کو قریب لاتا ہے، **ولکل واحد منھما بنون** اور ہر ایک کے بچے ہیں یعنی کچھ ایسے لوگ ہیں جو دنیا سے ایسی ہی وابستگی رکھتے ہیں جیسی وابستگی بچوں کو اپنی ماں سے ہوتی ہے، اور کچھ وہ ہیں جن کو آخرت سے ایسی وابستگی ہے جیسی ماں سے ہوتی ہے **فان استطعتم ان لاتکونوامن بنی الدنیا فافعلوا** اگر تم سے ہو سکے تو دنیا کے بچے نہ بنو تو ایسا کرلو **فانکم الیوم فی دارالعمل**

ولاحساب وانتم غدا فی دار الاٰخرة ولاعمل. آج تم دار العمل میں ہو جہاں محنت اور کمائی کرنی ہے اور یہاں حساب نہیں ہے اور کل تم آخرت میں ہوگے جہاں عمل نہیں ہوگا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

اس کے ساتھ ایک اور حدیث سن لیجئے اور اس کی روشنی میں اپنا اور اپنے معاشرے کا حال دیکھ لیجئے حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا **من کانت نیته طلب الاٰخرة جعل الله غناه فی قلبه وجمع له شمله واتته الدنیا وهی راغمة و من کانت نیته طلب الدنیا جعل الله الفقر بین عینیه شتّت علیه امره ولا یاتیه منها الا ما کتب له** (ترمذی) جس شخص کی نیت طلب آخرت کی ہوگی اللہ تعالی اس کے دل میں غنا (قلبی اطمینان اور مخلوق سے بے نیازی) نصیب فرمادیں گے، اور اس کے احوال کو درست فرمادیں گے اور دنیا اس کے پاس ناک رگڑ کر آئیگی اور جس کی نیت طلب دنیا کی ہوگی اس کی نگاہوں کے سامنے فقر و تنگ دستی ظاہر فرمادیں گے اور اس کے معاملات انتشار و بے اطمینانی کے شکار ہوں گے اور ساری محنت و کاوش اور پریشانی کے بعد بھی دنیا اسی قدر ملے گی جتنی لکھی جاچکی ہے۔

حضور اکرم ﷺ کے یہ ارشادات بالکل حق ہیں ان میں ذرا بھی شبہ نہیں اور ان کا تقاضا یہ ہے کہ انسان پورے طور سے آخرت کی طرف متوجہ ہو اور اس کی ساری نیت وطلب اسی کی ہو دنیا کو بطور دار العمل کے استعمال کرے، اس کا عمل آخرت کے لئے ہو دنیا کے لئے نہ ہو، پھر اس کا وہ ثمرہ حاصل ہوگا جس کا تذکرہ آخر الذکر حدیث میں ہے۔

لیکن کیا یہ تقاضا آج کسی درجہ میں پورا ہو رہا ہے۔ دنیا کی دنیا، طلب دنیا کے پیچھے مدہوش ہے، معیار زندگی کی ترقی، تہذیب وتمدن، معاشرہ اور سوسائٹی کے مختلف ناموں سے دنیا ہی کی دوڑ لگ رہی ہے، دل کے بگاڑ کا پورا سامان موجود ہے دل جس چیز سے بنتا ہے اس کا اہتمام تو برائے نام بھی نہیں ہے، پھر انسان کا حال درست ہو تو کیونکر ہو۔

دل کا بننا کیا ہے؟ اس کی علامت کیا ہے؟ اسے بھی ایک حدیث کی روشنی میں دیکھ

لیجئے، حضرت عبداللہ ابن مسعود ؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے اس آیت کریمہ کی تلاوت فرمائی **فمن یرد اللہ ان یھدیه یشرح صدره للاسلام** اللہ تعالیٰ جس کو ہدایت دینا چاہتے ہیں اس کے سینے کو اسلام کے لئے کھول دیتے ہیں، اس پر آپ نے فرمایا **ان النور اذادخل الصدر انفسح** جب یہ نور سینہ میں داخل ہوتا ہے تو سینہ اس کی وجہ سے کھل جاتا ہے، آپ سے دریافت کیا گیا کہ کیا اس کی کوئی علامت ہے جس سے اس کی شناخت ہو سکے؟ آپ نے فرمایا **نعم، التجافي عن دار الغرور، والانابة الیٰ دار الخلود، والاستعداد للموت قبل نزوله** ہاں دنیا جو دھوکے کی جگہ ہے اس سے طبیعت کا ہٹ جانا اور آخرت جو ہمیشہ قیام کی جگہ ہے طبیعت کا اس کی طرف رجوع ہو جانا، اور موت کے آنے سے پہلے اس کی تیاری میں لگ جانا۔

اس علامت کو ہر شخص اپنے دل میں تلاش کرے اور اپنے ماحول اور معاشرے پر بھی ایک نظر ڈال لے، اگر قلب کی یہ کیفیت مطلوب ہے، اور یقیناً مطلوب ہے، اور مطلوب بھی استحسان و استحباب کے درجے میں نہیں فرض و وجوب کے درجے میں ہے، اگر اسے حاصل نہیں کیا تو خسارہ ہی خسارہ ہے اور اسکا تعلق قلب سے ہے تو کیا قلب کے بناؤ کا اہتمام اور اس کی کوشش ہوتی ہے۔

کیا صرف تعلیم و تعلم سے، کتابوں کے مطالعہ سے قلب درست ہو سکتا ہے؟ کیا اس کے لئے علم کے لاتعداد ذرائع جو دنیا نے پید کر لئے ہیں ریڈیو، ٹی وی، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، سی ڈی، اور اللہ جانے کیا کیا بلائیں ہیں۔ کیا ان کا کوئی دخل دل کے بناؤ میں ہے؟ ظاہر ہے اگر ان کا کوئی بھی دخل دل کی اصلاح میں ہوتا تو آج دنیا کی دنیا صلاح وخیر کی نمونہ ہوتی، علم گھر گھر ہوتا، تقویٰ ہر ہر دل میں ہوتا، نیکی کا نور ہر ہر جگہ جگمگاتا، مگر کیا ایسا ہے؟

اس کا ایک ہی طریقہ ہے جس کا پہلے بہت اہتمام تھا اور جب اہتمام تھا تو انسانیت سنوری ہوئی تھی، جب وہ طریقہ کم ہوا اور پھر کم ہوتے ہوتے گم ہونے کے قریب ہو گیا، تو انسانیت خاتمے کے دہانے پر آ گئی، اور دنیا درندوں اور بہائم کے صفات و احوال

کے جنگل میں تبدیل ہوتی جا رہی ہے۔

حق تعالیٰ کا ارشاد ہے **یا ایھا الذین آمنوا اتقو اللہ و کونوا مع الصادقین** ، تقویٰ کا ایمان والوں کو حکم ہے، اوراس کا طریقہ بیان کیا گیا ہے کہ صادقین کی معیت میں رہو، مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دین وایمان میں احوال وکردار میں رفتار وگفتار میں سچے ہیں ان کے زمرہ میں رہو ان کی صحبت اختیار کرو، ان سے اس کی مشق وتمرین کرو۔

نفسانیت کو ترک کرنا اور ہدایت کی پیروی کرنا، نفس کا تزکیہ کرنا، ایک مشکل امر ہے، اس کا حصول تن تنہا انسان کے اپنے دماغ اپنی ذہانت اوراپنے عزم وحوصلہ کی بنیاد پر نہیں ہوسکتا، اس کے لئے مربی اور مزکی کی ضرورت ہے، رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ کا تزکیہ کیا اور پھر یہ سلسلہ چلتا رہا، حضرات مشائخ کرام اور صوفیائے عظام کے یہاں یہ کام ہوتا تھا، اوراب بھی دنیا خالی نہیں ہے، انہیں سے شرح صدر کا یہ نور قائم تھا، اوراب بھی جو کچھ ہے انھیں کی برکت سے ہے، یہ دولت ملے گی قلب کا تزکیہ ہوگا، نفس کی اصلاح ہوگی، آخرت کی فکر دل میں جاگے گی تو انھیں بزرگوں کی خدمت میں اورانھیں کے قدموں میں۔

آج تو دین کی خدمت کا نام لگا لگا کر کتنے لوگ تصوف سے اور صوفیا سے لوگوں کو بدکاتے ہیں، تصوف کو شریعت کا معارض قرار دیتے ہیں صوفیا کو دین سے منحرف بتاتے ہیں، ہاں جہاں ہر طریقہ میں غلط قسم کے افراد آجاتے ہیں ان میں بھی بہت سے گھس آئے ہیں، لیکن اسکی وجہ سے نہ تصوف کو غلط کہا جا سکتا ہے اور نہ سب مشائخ سے بدکایا جا سکتا ہے، ان لوگوں نے تصوف اور صوفیا کو مطلقاً بدنام کیا مگر جو چیز مطلوب ہے جو کچھ حضرات مشائخ کے یہاں ملا کرتا تھا اس کا کوئی انتظام نہیں کیا۔

جو کچھ مطلوب ہے وہ بھی معلوم ہے اور جہاں یہ مطلوب حاصل ہوگا وہ بھی متعین ہے، پس بزرگوں اور مشائخ کی صحبت اختیار کرنی ضروری ہے، ہاں یہ ضرور ہے کہ مشائخ میں امتیاز چاہئے، انہیں حضرات کی صحبت اختیار کریں جو اہل حق میں ہوں، بزرگوں کے صحبت یافتہ ہوں ان سے تربیت حاصل کی ہو جو صاحب نسبت ہوں۔

حضرات صوفیہ کا موضوع علم وعمل، تہذیب نفس اور تزکیۂ قلب ہے، اللہ تعالیٰ نے امت کے حق میں رسول اکرم ﷺ کو جو ذمہ داری سونپی ہے، اس کا بیان قرآن کریم میں وضاحت کے ساتھ متعدد جگہوں پر کیا گیا ہے فرماتے ہیں:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْ عَلَيْهِمْ اٰيَاتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلَالٍ مُبِيْنٍ اللہ نے اہل ایمان پر احسان فرمایا کہ ان میں، انھیں کی جنس سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا، جو ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے، اور انھیں پاکیزہ بناتا ہے اور انھیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور کوئی شبہ نہیں کہ اس سے پہلے وہ کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ میں رسول اللہ ﷺ کی تین ذمہ داریاں الگ الگ بیان کی گئی ہیں، ۱:-تلاوت آیات، ۲:- تزکیہ، ۳:-تعلیم کتاب وحکمت۔ رسول اللہ ﷺ ان تینوں مناصب کے جامع تھے، آپ نے بیک وقت تینوں کام کئے، اور علی وجہ الکمال کئے۔ آپ کی تلاوت اور تربیت وتعلیم سے دنیا کا سب سے پاکیزہ، سب سے بلند مرتبہ، اور سب سے زیادہ خدا کو راضی کرنے والا معاشرہ وجود میں آیا جسے اللہ تعالیٰ نے بار بار سند مقبولیت سے نوازا، اسے حق وصداقت کا معیار ٹھرایا۔ اس کے بکثرت افراد کو نام بنام جنت کا مستحق قرار دیا، اجمالاً سب سے وعدۂ جنت کیا۔ **وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى**.

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد نہ وہ جامعیت رہ سکتی تھی، نہ وہ درجۂ کمال رہ سکتا ہے، پھر ذمہ داریاں الگ الگ افراد اور جماعتوں کے ساتھ مختص ہونے لگیں، تلاوت کا منصب ایک جماعت کو ملا، وہ اس میں ممتاز ہوئی، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کی ذمہ داریاں دوسرے حضرات کو ملیں، وہ ایک بڑا طبقہ امت کا ہے، اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ ہے، کہ یہ سارے سلسلے لوگوں کی صلاحیت ولیاقت کے مطابق اب تک چل رہے ہیں، تزکیہ وتربیت کو جس گروہ نے سنبھالا وہ مشائخ اور صوفیہ کے لقب سے ممتاز ہوئے، ان حضرات نے پہلے خود کسی مزکی اور مربی کی خدمت میں رہ کر اپنا تزکیہ کیا، ریاضات ومجاہدے کئے، نفس کی

خواہشات وشہوات کو روکا اور توڑا۔ اللہ کی مرضی میں خود کو فنا کرنا سیکھا، سب سے کٹے، حق تعالیٰ کی بارگاہ میں تبتـــــل (یکسوئی کامل) اختیار کیا، ذکر الٰہی اس کثرت سے کیا کہ ان کا رواں رواں ذاکر بن گیا، یاد الٰہی ان کے قلب وجگر کی غذا اور دوا بن گئی۔ ان کے یہاں علائق دنیا آئے تو انھوں نے اگر قبول کیا، تو اللہ کے واسطے قبول کیا، نفس کو برطرف رکھا۔ فرائض کا قرب انھیں حاصل ہوا، پھر نوافل نے انھیں اور شرف قرب بخشا۔

ان کیفیات کی وجہ سے جو خالص موہبت الٰہی ہیں، یہ حضرات پارس بن گئے، پھر جو بھی ان کی خدمت میں اعتقاد ومحبت سے رہا، مٹی تھا، تو سونا بن گیا، کنکر تھا تو موتی بن گیا، قطرہ تھا، تو گہر بن گیا، چنگاری تھا، تو شعلۂ جوالہ بن گیا۔ اور اس طرح چراغ سے چراغ جلتا رہا، جیسا کہ حدیث کی خبر ہے، **مثل امتي كمثل المطر لا يدري اولها خير أم آخرها**۔ میری امت کی مثال بارش جیسی ہے، نہیں کہا جا سکتا ہے کہ اس کا ابتدائی حصہ بہتر ہے، یا بعد والا۔ بعد میں بھی ایسے عالی استعداد اور عالی نسبت بزرگ پیدا ہوئے، جو آفتاب کی طرح چمکے اور ایک دنیا کو روشن کر گئے۔

یہ حضرات قرآن وسنت کا علم رکھتے تھے، اسی کی روشنی میں چلتے تھے، اس کی گہری سمجھ رکھتے تھے، قرآن وسنت کی روشنی میں ہر زمانے کے لحاظ سے، طبیعتوں کی ذکاوت وغباوت کے اعتبار سے، مزاج اور جسم کے ضعف اور قوت کا خیال کر کے تزکیہ اور تربیت کے مختلف پیرائے اختیار کئے۔ پھر ان طریقوں کے عمل میں لانے سے انسانی طبیعت جن کیفیات سے دوچار ہوتی ہے، کبھی سستی کبھی چستی، کبھی انشراح، کبھی انقباض، کبھی امید، کبھی یاس، کبھی اضمحلال، کبھی نشاط، کبھی خلوت ویکسوئی کا غلبہ، کبھی جلوت ومحبت کا جذبہ، کبھی اپنی ہی ذات میں مشغولیت اور کبھی خلائق میں تبلیغ کا داعیہ! ان کیفیات کے تعارف کے لئے ان حضرات نے ان کے نام رکھے، پھر قرب ورضاء الٰہی کے جن درجات کا ادراک انھیں ہوتا ہے، انھیں بھی امتیاز وشناخت کے لئے علیحدہ علیحدہ عنوان دیے، پھر ذکر وفکر کی کثرت اور ریاضات ومجاہدات کی تاثیرات نے جہاں ان کے نفوس کی بہیمیت کو فنا کیا، مادی خواہشات

وشہوات سے ان کے دامن دل کو پاک کیا، وہیں ان کی طبیعتوں میں ایسی استعداد پیدا کی کہ عالم غیب سے انھیں خاص مناسبت پیدا ہوگئی، پھر ان کے آئینۂ قلب پر حقائق غیبیہ کا مشیئت الٰہی کے تحت انعکاس ہونے لگتا ہے، قرآن وحدیث کے علوم ومعارف ان پر کھلنے لگتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان پر ایسے اسرار ومعارف کا انکشاف فرماتے ہیں، جن سے عام لوگ بے بہرہ ہوتے ہیں، وہ کبھی ان حقائق ومشاہدات کو بیان بھی کرتے ہیں۔ اس کے لئے انھیں خاص خاص تعبیرات اور محاورات سے کام لینے کی ضرورت پیش آئی۔ ان سب کے مجموعے کا نام ’’تصوف‘‘ مشہور ہوا۔

اس مجموعے کے تمام اجزاء ایک حیثیت اور نوعیت کے نہیں ہیں، اس میں بعض چیزیں تو مقاصد ہیں، بعض وسائل وذرائع ہیں، بعض ثمرات ونتائج ہیں، بعض طبعی کیفیات و احوال ہیں، پھر جو الفاظ وعبارات تصوف میں لکھے اور بولے جاتے ہیں، ان کے مخصوص معانی اور خاص تشریحات ہیں، اگر ان الفاظ واصطلاحات کو ان کے خاص معانی ومفاہیم سے ہٹادیا جائے، تو بات کچھ کی کچھ ہوجاتی ہے، اس لئے صوفیا کے معارف وحقائق، احوال ومواجید اور ان کے کلمات وعبارات کو سمجھنے کے لئے ایک خاص ذوق، اور معتد بہ علم کی ضرورت ہے، ورنہ وہی قصہ ہوگا کہ

سارت مشرقة و سرت مغرباً فشتان بين مشرق و مغرب

محبوبہ تو مشرق میں گئی، اور تم نے مغرب کا سفر اختیار کیا، تو مشرق ومغرب کی جانب سفر کرنے والے کے درمیان بہت فاصلہ ہے۔

تصوف کے بارے میں کتنی غلط باتیں، اسی بدفہمی کی وجہ سے پیدا ہوگئی ہیں۔

پھر تصوف کو جن بدفہموں نے بدنام کیا، اور اس سے خود بھی بدکے اور دوسروں کو بھی بدکایا، اس میں دخل صرف معاندین اور مخالفین ہی کا نہیں ہے، بلکہ اچھا خاصا حصہ ان لوگوں کا بھی ہے، جو تصوف کا دم بھرتے ہیں، اور اس کی حمایت ووکالت کرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ تصوف کا نصب العین بہت بلند ہے، اور وہ دین کے اعلیٰ مقاصد میں

ہے، یعنی اللہ کی رضا مندی وخوشنودی کو محور بنا کر زندگی کو اس پر دائر کرنا، یہ نصب العین وہ ہے کہ انسان کے لئے اس سے بلند نصب العین نہیں ہو سکتا۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی علیہ الرحمہ نے تفہیمات الٰہیہ میں تحریر فرمایا ہے کہ:

ومعظم ما دعت إلى إقامته الرسل أمور ثلثة (۱) تصحيح العقائد في المبدأ والمعاد والمجازاة وغيرها...... (۲) وتصحيح العمل في الطاعات المقربة والارتفاقات الضرورية على وفق السنة...... (۳) وتصحيح الاخلاص والاحسان الذين هما اصلا الدين الحنيفي الذي ارتضاه الله لعباده.

جس چیز کے قیام واہتمام کی اللہ کے رسولوں نے دعوت عام دی ہے، وہ بنیادی طور پر تین امور ہیں: (۱) عقائد کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق مبدأ سے ہو یا معاد سے، یا جزاء وسزا وغیرہ سے...... (۲) اعمال کی تصحیح، خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو، یا زندگی کے دوسرے مسائل ومعاملات سے...... (۳) اخلاص اور احسان کی تصحیح کہ یہ دونوں دین حنیف کی اصل بنیاد ہیں، وہ دین حنیف، جس کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے منتخب اور پسند فرمایا ہے۔

اس تیسرے امر کی اہمیت شاہ صاحب ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: **والذي نفسي بيده هذا الثالث أدق المقاصد الشرعية مأخذاً وأعمقها محتداً بالنسبة إلى سائر الشرائع وبمنزلة الروح من الجسد وبمنزلة المعنى من اللفظ وتكفل بها الصوفية رضوان الله عليهم فاهتدوا وهدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصوىٰ وحازوا السهم الاعلى** (ج:۱، ص:۱۳)

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ تیسرا امر، مقاصد شرعیہ میں سب سے دقیق اور سب سے گہرا ہے، بہ نسبت اور دوسرے احکام کے، یہ ایسا ہے جیسے

بدن کے لئے روح، اور لفظ کے لئے معانی، اس اہم مقصد کا تکفل حضرات صوفیہ رضوان اللہ علیہم نے کیا، پس وہ خود راہ یاب ہوئے، اور دوسروں کو بھی راہ پر لگایا، خود سیراب ہوئے، اور دوسروں کو بھی سیراب کیا، اور انتہائی سعادت سے سرفراز اور مقصد اعلی کے اوپر فائز المرام ہوئے۔

شاہ صاحب کے اس کلام سے معلوم ہوا کہ اخلاص واحسان ایسی چیز ہے کہ علوم واعمال کی اس کے بغیر کچھ حیثیت ہی نہیں رہ جاتی، چنانچہ اعمال کے اعتبار سے فرمایا کہ: بغیر اخلاص کے وہ ایسا ہے جیسا کہ جسم ہو مگر روح ندارد ہو، اور علوم کے اعتبار سے یوں تشبیہ دی جیسے محض الفاظ ہوں، اور ان کے معنی کچھ نہ ہوں، یعنی عمل بے روح اور مردہ اور علم بے معنی اور مہمل!

ظاہر ہے کہ جس چیز کا یہ درجہ اور رتبہ ہو اس کا حصول کتنا ضروری ہوگا، لیکن یہ بھی ایک روشن حقیقت ہے کہ یہ مقصد اعلی از خود کسی کو حاصل نہیں ہوسکتا، نہ مطالعۂ کتب اس کے لئے کافی ہے، انسانی فطرت ازل سے یہی رہی ہے کہ کوئی بھی فن ہو، صاحب فن ہی سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں صاحب فن جس سے یہ دولت سرمدی حاصل کی جاسکتی ہے، اسے تصوف کی اصطلاح میں شیخ اور مرشد کہا جاتا ہے، یہ شیخ کیسا ہونا چاہئے اسے بھی حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی علیہ الرحمہ ہی سے سنئے، فرماتے ہیں:

والشرط الخامس ان یکون صحب المشائخ و تأدب بھم دھراً طویلاً و اخذ منھم النور الباطن والسکینۃ. پانچویں شرط یہ ہے کہ بیعت لینے والا مرشد کامل کی صحبت میں رہا ہو، اور زمانۂ دراز تک ان سے ادب سیکھا ہو، اور ان سے باطن کا نور اور اطمینان حاصل کیا ہو۔

حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے بلند پایہ صاحبزادہ حضرت شاہ رفیع الدین صاحب علیہ الرحمۃ نے مزید کچھ اور وضاحت فرمائی ہے، اسے ملاحظہ فرمائیے، ان کا ایک مختصر رسالہ بنام ''بیعت'' ہے، اس میں فرماتے ہیں، اصل عبارت فارسی میں ہے، ہم

اس کا ترجمہ اور حاصل پیش کرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ:

بیعت شریعت کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی عام آدمی جس نے غفلت و معصیت میں زندگی کا کچھ حصہ گذارا ہو، جب اسے اپنے حال پر تنبہ ہو اور ندامت اس کا دامن کھینچے، اور وہ تقویٰ و طاعت کی طرف پلٹنا چاہے، تو یہ چیز عادۃً اسے اس کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتی، کہ وہ کسی متقی عالم کو اپنے ظاہر و باطن پر حاکم بنائے، کیونکہ شریعت کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ایسا ہی ہے، جیسے طب کی کتابوں کا مطالعہ کرنا، کہ طب میں ملکہ و مہارت کے بغیر علاج اور اصلاح مزاج بغایت دشوار ہے، (تو محض کتاب خوانی سے مقصد نہیں حاصل ہوسکتا)۔

اسی طرح ہر عالم کے قول پر عمل کرنا بھی باعث تحیر ہوگا، کیوں کہ ہر شخص صحیح الفکر اور صحیح الحواس نہیں ہوتا، اس لئے اپنا شیخ و مصلح ایسے شخص کو بنانا چاہئے، جو علم وتقوی کے علاوہ دو صفت اور بھی رکھتا ہو، ایک یہ کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے باب میں تساہل اور مداہنت روا نہ رکھتا ہو، دوسرے یہ کہ طالب کے حال کے لئے آسان اور افضل کیا چیز ہے، اس کی پہچان رکھتا ہو، ایسے شخص کا انتخاب کرے، اور اپنے تمام امور کی باگ ڈور اس کے حوالے کردے، اور اس کے اتباع کو اپنے اوپر لازم کرلے، تاکہ اپنی مراد کو پہونچے، اس کا ثمرہ اور نتیجہ آخرت میں نجات کلی اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رسائی اور مولیٰ تعالیٰ کی رضا کا حصول ہے (ص ۲۷)

علامہ ابواسحاق شاطبی نے الموافقات میں عالم باعمل......جس کی صحبت اکسیر ہے ......کی تین علامتیں ذکر کی ہیں۔

(۱) اپنے علم پر عمل کرتا ہو، اس کا عمل اس کے قول کے مطابق ہو، اگر ایسا نہیں ہے تو وہ اس بات کا اہل نہیں ہے کہ اس سے علم حاصل کیا جائے، یا اس کی صحبت اختیار کی جائے۔

(۲) یہ کہ مشائخ نے اس کی تربیت کی ہو، ان سے اس نے علم سیکھا ہو، اور ان کی خدمت و صحبت میں رہا ہو۔

(۳) جن سے اس نے علم حاصل کیا ہے ان کی اقتداء کرتا ہو، اور ان کے حضور با ادب رہا ہو۔

یہ باتیں نگاہ میں رکھی جائیں تو آدمی کی صحیح تربیت ہوسکتی ہے، اور جب تک اس کا اہتمام رہا، عمدہ صلاحیتوں کے لوگ نکھر نکھر کے سامنے آتے رہے، اور خشیت وتقویٰ، اخلاص واحسان کے نمونے جابجا بکثرت پائے جاتے تھے، اور فضائے عالم میں روحانیت کی پر کیف ہوائیں دم بدم چلا کرتی تھیں، مشائخ کا مقصد ہوتا تھا، اللہ تک پہونچانا اور زندگی میں اخلاص واحسان کا پیدا کرنا، اور مریدین کا مقصد ہوتا تھا، اللہ کی رضا وخوشنودی حاصل کرنا۔

اب اللہ جانے کیا ہوا چلی ہے، کہ ایک بڑی تعداد اس مقصد اصلی سے غافل ہی نہیں منکر ہے، وہ جسم بلا روح اور الفاظ بلا معنی پر قانع ہوکر رہ گئی ہے۔ قانع نہیں اسی کو کافی سمجھتی ہے، اور اصل روح ومعنی کا انکار کرتی ہے، حالانکہ اس کے نہ ہونے سے، ہر طرف نفسانیت کا طوفان اٹھ رہا ہے۔

پھر کچھ لوگ ہیں، جو اس کی ضرورت کے قائل ہیں، لیکن وہ بھی عجب عجب خبط میں مبتلا ہیں، جو مقاصد ہیں، انھیں بھلائے بیٹھے ہیں، اور وسائل وذرائع کو مقصد کے درجہ میں پہونچائے ہوئے ہیں، مقصد تھا، اخلاص واحسان، اور رہ گیا ہے جذبہ جاہ ومال یا شعبدہ وبازی گری! اس سے تصوف بدنام ہو رہا ہے، کام تو یہ تھا کہ دل پر سے غیر اللہ کی حکمرانی ختم ہو، صرف رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ غالب ہو، اور ہونے یہ لگا ہے کہ تسخیر خلائق ہو، خیالی نور کا ظہور ہو، خوابوں کی تکرار ہو، توجہ وتصرف کی شعبدہ بازی ہو، پھر بلند بانگ دعوے ہوں، جو اٹھائے نہ اٹھیں، اور گرائے نہ بنیں، یہ سب غیر اللہ کی مشغولیتیں ہیں، جن سے آدمی اصل کام سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔

کچھ لوگ ہیں، جن کا جذبۂ قلب استخلاف وخلافت کے لئے بے قرار رہتا ہے، ادھر مرید ہوئے، ادھر خلافت ملی، پیر ومرشد بن بیٹھے۔ نہ صلاحیت نہ استعداد، جیسے دوکان میں مال سجانا اور نمائش کرنا مقصود ہے، تصوف کی حرمت اس سے جتنی پامال ہوتی ہے، کم

چیزوں سے پامال ہوتی ہے۔

شیخ محی الدین ابن عربی علیہ الرحمہ نے اپنے زمانے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، آج کا رنگ دیکھتے تو اللہ جانے ان کا کیا تاثر ہوتا فرماتے ہیں: **ان الزمان مشحون بالدعاوى الكاذبة العريضة فلا مريد صادق ثابت القدم في مسلكه ولا شيخ محقق ينصحه فيخرج من رعونة نفسه برأيه واعجابه برأيه ويعرب له عن طريق الحق فالمريد يدعي الشيخوخة والرياسة وهذا كله تخبيط وتلبيس.** (آداب الشیخ والمرید ص۸)

زمانہ لمبے چوڑے دعووں سے بھرا ہوا ہے، نہ کوئی مرید ہی صادق اور سلوک میں ثابت قدم نظر آتا ہے، اور نہ کوئی شیخ ہی محقق نظر آتا ہے، جو کہ مرید کی خیر خواہی کرے، اور اس کو نفس کی رعونت اور خودرائی سے نکالے، اور طریق اس کے سامنے ظاہر کرے، تو اب مرید ہی شیخوخت اور بڑائی کا مدعی ہے، اور یہ سب خبط و تلبیس ہے۔

اللہ ہی جانتا ہے کہ مقصد کی بلندی، جب پستی کی طرف مائل ہوتی ہے، تو کس حد تک گرتی ہے، یہ لمبے چوڑے دعوے، یہ مریدوں کا ہجوم، یہ خلافت و مشیخت کی نہ بجھنے والی پیاس، یہ گروہ بندی، یہ سلسلہ کی اشاعت و تکثیر کے نام پر دولت مندوں اور امراء و حکام کو دام تسخیر میں لانا، ان میں سے کوئی چیز حقیقی تصوف سے میل نہیں کھاتی۔ یہاں تو رضائے الٰہی کا حصول، زہد و قناعت، تسلیم و رضا، تواضع و فنائیت، انکار خودی و تکبر، اتباع طریق و سنت، ذکر الٰہی کی کثرت، کشمکش نفس کے بغیر طاعت و عبادت، امانت و دیانت، خشوع و خضوع اصل سرمایہ ہے۔

احمد تو عاشقی بمشیخت ترا چہ کار دیوانہ باش سلسلہ شد شد نہ شد نہ شد

احمد تم تو عاشق ہو، تمھیں مشیخت سے کیا تعلق؟ دیوانہ بنے رہو، سلسلہ ہوا، ہوا، نہ ہوا، نہ ہوا۔

بحمد اللہ دعاوی کے لمبے چوڑے سمندر میں، اور ہوسناکیوں کے اس جنگل میں اب بھی ایسے لوگ ہیں، جو خاموشی سے راہ خدا کی رہنمائی فرماتے رہتے ہیں، کمیاب سہی نایاب

نہیں ہیں۔

جس متاع گمشدہ کا سراغ بتایا گیا ہے، الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ ابھی دنیا سے اٹھ نہیں گئی ہے، یہ دولت انھیں بزرگوں کے قدموں میں ملے گی، جن کی کچھ شناختیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔ ضرورت کی ہر چیز ہر زمانے کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ مہیا فرماتے ہیں، اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے، اس لئے نہیں لکھا گیا ہے کہ لوگ اپنی آس توڑ بیٹھیں، اور حسن ظن کھو بیٹھیں، بس مقصد یہ ہے کہ آدمی دیکھ بھال لے۔ پرکھ پرکھا لے۔ اصحاب علم سے معلومات کر لے، پھر جہاں نگاہ جم جائے، دین کا فائدہ ہونے لگ جائے۔ دنیا سے دل سرد ہو، آخرت کی رغبت اور اس کا شوق پیدا ہو جائے، رضائے الٰہی کے حصول کا جذبہ دل میں کروٹیں لینے لگے۔ نفس کی تیزی ٹوٹ جائے، اگر یہ صفات کہیں ملتی ہوں، اور یقیناً ملیں گی، تو ایسے لوگوں سے ربط رکھیں، ان شاء اللہ تقویٰ وخشیت اور نور باطن کی سوغات حسب استعداد مل جائے گی۔

وما ذلک علی الله بعزیز

☆☆☆☆☆☆

﷽

تصوف کیا ہے؟

تمہید:

شیخ ولی الدین محمد بن عبداللہ الخطیب التبریزی نے اپنی مشہور کتاب مشکوٰۃ المصابیح کے **باب اشراط الساعة** میں سنن ترمذی کے حوالہ سے ایک طویل حدیث حضرت ابوہریرہ ﷺ کی روایت سے نقل کی ہے۔ جس میں رسول اللہ ﷺ نے چند خاص خاص برائیاں ذکر کی ہیں جن کے عموم وشیوع کے نتیجے میں دنیا کو سرخ آندھیوں، زلزلوں، زمین میں دھنسا دیئے جانے، آسمان سے سنگباری اور مسلسل حوادث ومصائب کا انتظار کرنا چاہئے۔ یہ کل چودہ امور ہیں جن میں سے آخری بات کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے: **ولعن آخر هذه الامة اولها۔** امت کے پچھلے لوگ اگلوں کو مورد لعن قرار دیں گے۔ گویا رسول اللہ ﷺ کے نزدیک امت کے سابقین اولین کو لعنت وملامت کرنا جب کہ بعد والوں کو دین کا علم اور دین کا عمل انہیں اگلوں سے ملا ہے، ایسا ہولناک گناہ ہے جس پر سرخ آندھیاں آسکتی ہیں۔ زلزلہ آسکتا ہے، ہوسکتا ہے کہ زمین پھٹ جائے اور لوگ اس میں دھنسا دیئے جائیں، یہ بھی اندیشہ ہے کہ صورتیں بگاڑ دی جائیں، حد یہ ہے کہ آسمان سے پتھر بھی برس سکتے ہیں۔

آج قلم وکاغذ اور طباعت واشاعت کے بحرانی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر روز بازار میں نئی نئی کتابیں اور نئے نئے مضامین، نئے نئے افکار سے مالا مال گونا گوں مؤلفین واہل قلم کے قلم سے نکل نکل کر بازار میں آرہے ہیں، غیر مسلموں کی بات نہیں خود مسلمانوں میں زبان وقلم کی جو بہتات ہے کسی پڑھے لکھے پر مخفی نہیں ہے۔ یہ کتابیں اور یہ مضامین اگر حقائق پر مشتمل کتاب وسنت کے ترجمان ہوتے، اسلامی مسائل واحکام کی تشریح وتوضیح کرتے تب تو کچھ شکایت نہ ہوتی مگر مصیبت یہ ہے کہ جس نے چند حروف پڑھ لئے اور اس

کے دماغ میں کچھ سوچنے کی صلاحیت ہے وہ بیتاب ہے کہ کسی طرح اپنے نتائج افکار کو خواہ وہ بالکل بودے اور عقل وفہم سے بعید ہوں، منظر عام پر پیش کرے۔ ان افکار میں اگر کوئی خوبی ہوتی ہے تو بس یہ کہ وہ نئ چیزیں سامنے لاتے ہیں جن کا سلف میں ذکر بھی نہ ہو۔

حضرت معاذ بن جبلؓ کا ارشاد ہے کہ قرآن شریف لوگوں میں عام ہو جائے گا، اسے عورتیں بھی پڑھیں گی مرد اور بچے بھی پڑھیں گے اس وقت کوئی آدمی سوچے گا کہ میں نے قرآن پڑھ لیا لیکن میری پیروی نہیں کی جاتی پھر اس پر عمل کا اہتمام کرے گا، تب بھی اس کی پیروی نہیں جائے گی۔ پھر وہ اپنے گھر میں مسجد بنا کر عبادت میں لگ جائے گا، پھر بھی اس کی پیروی نہ کی جائے گی، اب وہ اپنے دل میں کہے گا کہ میں نے قرآن پڑھا اور کسی نے مجھے اہمیت نہ دی، کہ میرا اتباع کرتا، میں نے اس پر عمل کیا پھر بھی میں مقتدا نہ بنا، پھر میں نے اپنے گھر کو مسجد بنا ڈالا تب بھی کوئی میرے پیچھے چلنے والا نہ نکلا، اچھا اب میں نئ تحقیقات اور نئ باتیں پیش کروں گا، ایسی تحقیقات اور ایسی باتیں جو نہ اللہ کی کتاب میں ہوں اور نہ انہوں نے اللہ کے رسول سے سنا ہوگا، شاید اس سے میری اہمیت ہو، اور میری پیروی کی جائے۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ خبردار اس کی باتوں پر دھیان نہ دینا، وہ گمراہی ہے۔

(جمع الفوائد ج:۱ص:۶۲ بحوالہ دارمی)

ہم دیکھتے ہیں کہ آج یہی جذبۂ تجدد ہے اور یہی ہوس مقتدائیت ہے، جو لوگوں کی زبان وقلم سے نئ نئ تحقیقات اور نئ نئ باتیں نکلواتی رہتی ہے۔

پھر یہ بھی بکثرت ہوتا ہے کہ لوگ سرسری طور پر کتب احادیث وتفسیر کی ورق گردانی کر کے ہمہ دانی کے زعم میں مبتلا ہو جاتے ہیں، اور ان سے جو کچھ اپنی استعداد کے مطابق الٹے سیدھے مطالب اخذ کر لیتے ہیں، ان کو اسلاف کی کتابوں اور ان کی زندگیوں میں تلاش کرنے لگتے ہیں، اور جب وہ اپنی فہم کے لحاظ سے ان کے مطابق نہیں پاتے یا کچھ کم وبیش دیکھتے ہیں تو ان پر زبان طعن دراز کرنے لگتے ہیں۔

یہ بات ہم علم وعمل کے ہر شعبے میں بہت عرصے سے دیکھ رہے ہیں لیکن اس باب

میں مطعون تر اور مظلوم تر جو شعبہ ہے وہ احسان وسلوک کا شعبہ ہے، جس کا اصطلاحی نام "تصوف" ہے۔ اور جس گروہ پر سب سے زیادہ مشق ستم کی جاتی ہے وہ صوفیہ کا گروہ ہے۔ تصوف سے بڑھ کر کوئی بدعت نہیں اور صوفیہ سے بڑھ کر کوئی گمراہ نہیں، یہ لے ادھر چند برسوں سے اتنی بڑھ گئی ہے کہ جن حلقوں میں تصوف کل تک سرمایۂ افتخار اور وجہ سعادت تھا، جس کے حصول کے بغیر آدمی کی دینی شخصیت ناتمام اور ادھوری سمجھی جاتی تھی۔ آج انہیں حلقوں کے افراد اس کے نام اور نسبت سے شرمانے لگے ہیں، کل تک جن بڑوں نے تصوف کے ذریعہ اپنی شناخت پیدا کی تھی، آج انہیں کے چھوٹے اسے باعث ننگ سمجھنے لگے ہیں، اولین سابقین کو تو چھوڑیئے قرون متاخرہ میں کون نہیں جانتا کہ کم از کم اسی برصغیر ہندو پاک میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی اور ان کی اولاد واحفاد، حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کی اولاد، نیز حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی اور ان کے نامور صاحبزادگان اور روحانی ومعنوی اخلاف یہ سب حضرات نہ صرف یہ کہ تصوف اور صوفیہ کے علم وعمل کے ذوق آشنا تھے بلکہ اس کے زبردست داعی اور وکیل بھی تھے۔ ان کی زندگیوں سے تصوف نکال لیجئے تو ان کے کمالات کی روح فنا ہو جائے گی، پھر ان کے بعد علماء دیوبند کے اساطین مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی کی ساری زندگی تصوف ہی کے محور پر گردش کرتی رہی، ان کے کمالات کا ہر معقول شخص کو اعتراف ہے۔ لیکن ستم ظریفی کی حد ہے کہ جن ذرائع سے یہ اکابر کمالات کو پہونچے اور جس کو انہوں نے ہمیشہ اپنے لئے باعث سعادت سمجھا اور جس سے ایک لمحہ کیلئے جدا ہونا پسند نہیں کیا اسی کو ان کے بہت سے اخلاف مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔

غلط فہمیاں:۔ تصوف کے سلسلے میں غلط فہمیوں کی لمبی زنجیر ہے، جس میں وہ لوگ بھی گرفتار ہیں جو اس کے منکر ہیں اور وہ لوگ بھی جو اس کے قائل ومعترف ہیں، جو لوگ تصوف کے قائل ہیں، ان کی غلطی یہ ہے کہ بہت سے وہ امور جو اس فن میں مطلوب ومقصود نہیں ہیں انہیں لوگوں نے عین مامور ومقصود سمجھ رکھا ہے۔ اور ان میں ایسا غلو کئے

ہوئے ہیں کہ اگر انہیں ترک کر دیا جائے یا کسی دینی مصلحت کی خاطر ان میں تغیر وتبدل کر دیا جائے تو گویا ان کے خیال میں تصوف ہی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اور بعضوں نے تو حد ہی کر رکھی ہے، کہ اس کو شریعت سے الگ کوئی چیز سمجھتے ہیں، اور منکرین کی غلط فہمی یہ ہے کہ ہر وہ چیز جس کو کسی نے ......خواہ وہ کتنا ہی ناتمام شخص ہو......تصوف کے نام سے پیش کر دیا اسے تصوف سمجھ کر قرآن وسنت کے معیار پر پرکھنے لگے، اور اسے اس کے مطابق نہ پا کر پورے تصوف ہی کے انکار پر تُل گئے۔ حالانکہ جس طرح ہر جماعت میں معتبر اور غیر معتبر افراد ہوتے ہیں۔ اسی طرح صوفیہ میں بھی دونوں طرح کے افراد ہیں۔ پس اس باب میں ہمیشہ انہیں کا ارشاد معتبر ہوگا جو تصوف کے محققین ہوئے ہیں۔ ہر وہ شخص جو اپنا شمار صوفیہ میں کرتا ہو اس کی بات معتبر نہ ہوگی۔ خود محققین صوفیہ نے ان کا رد کیا ہے۔ اس لئے یہ کسی طرح مناسب نہیں غیر محقق افراد کے اقوال کو تصوف اور صوفیہ کے سر تھوپ کر تصوف کا انکار کیا جائے۔ اور بعض لوگوں نے اور ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہیں ہے......تصوف کا سنجیدگی سے مطالعہ نہیں کیا، حقائق کو نہیں پہچانا، رسوم کو تصوف سمجھ لیا اور غلط فہمیوں میں پڑ گئے۔

اس مقالہ میں قصد یہ ہے کہ تصوف کی حقیقت، اس کے مقاصد، اس کے مبادی و ثمرات، نیز احوال صوفیہ پر اس طرح روشنی ڈالی جائے۔ کہ اصل حقیقت واضح ہو جائے، غلط فہمیاں دور ہو جائیں اور کام کرنیوالوں کی ہمتیں تازہ ہو جائیں، دلوں سے افسردگی دور ہو جائے۔

☆☆☆☆☆

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کے آغاز میں حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کی ایک عبارت نقل کر دی جائے۔ جس میں انہوں نے نہایت ایجاز وبلاغت کے ساتھ شریعت اسلامی کا مکمل تعارف پیش کر دیا ہے۔ شاہ صاحب کی مشہور تالیف تفہیمات الٰہیہ ہے اس کے پہلے حصہ میں تحریر فرماتے ہیں:

ومعظم ما دعت الى ا قامته الرسل امور ثلٰثة تصحيح العقائد فى المبدأ والمعاد والمجازاة و غيرها وقد تكفل بهذا الفن اهل الاصول من

علماء الامة شکر اللہ مساعیهم و تصحیح العمل فی الطاعات المقربة والارتفاقات الضروریة علی وفق السنة وقد تکفل بهذا الفن فقهاء الامة فهدی الله بهم کثیرین واقام بهم فرقة عوجاء .

وتصحیح الاخلاص والاحسان الذین هما اصلا الدین الحنیفی الذی ارتضاه الله لعباده ، قال تبارک و تعالیٰ وَمَا اُمِرُوْا اِلَّالِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَاءَ وَ يُقِيْمُوْا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةُ . وقال ، اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ عُيُوْن آخِذِيْنَ مَا آتَاهُمْ رُبُّهُمْ اِنَّهُمْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ كَانُوْا قَلِيْلاً مِّنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَ بِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَ فِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ وَ فِی الْاَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوْقِنِيْنَ وَ فِیْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ،وقال رسول الله ﷺ انما الاعمال بالنیات و قال فی جواب جبرئیل الاحسان ان تعبد الله کانک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک ۔

والذی نفسی بیده هذاالثالث ادق المقاصد الشرعیة مأ خذا واعمقها محتداً وهو بالنسبة الی سائر الشرائع بمنزلة الروح من الجسد و بمنزلة المعنیٰ من اللفظ و قد تکفل به الصوفیة رضوان الله علیهم فاهتدوا و هدوا واستقوا وسقوا وفازوا بالسعادة القصویٰ وحازوا السهم الاعلیٰ فلله درهم ما اعم نفعهم و اتم نورهم (تفهیمات الٰهية: ج: ا ص: ۷)

ترجمہ: اور حضرات انبیاء نے جن امور کی اقامت کی جانب دعوت دی ہے۔ ان میں اہم اور بنیادی تین باتیں ہیں۔

(۱) مبدأ و معاد نیز جزا وسزا کے متعلق عقائد کی تصحیح کرنا۔ اس فن کی ذمہ داری علماء امت میں سے اہل اصول یعنی متکلمین پر ہے۔ اللہ تعالیٰ ان حضرات کی سعی مشکور فرمائے۔

(۲) خدا تعالیٰ کا قرب حاصل کرانے والی طاعات اور ضروری معاملات وارتفاقات کے

سلسلے میں سنت کے مطابق عمل در آمد کی تصحیح۔ اس فن کی ذمہ داری فقہاء امت نے لی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ذریعہ سے بہت سے لوگوں کو ہدایت بخشی اور ان کے واسطے سے بہت سے کج رَو فرقوں کو درست کیا۔

(۳) اخلاص اور احسان کی تصحیح، کہ یہی دونوں اس دین حنیف کی بنیاد ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کیلئے پسند فرمایا، حق تعالیٰ فرماتے ہیں اور نہیں حکم دیا گیا ان لوگوں کو مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں اس طرح کہ عبادت کو خاص اسی کیلئے کرنیوالے ہوں، اور نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور یہی طریقہ ہے ان درست مضامین کا۔

اور فرمایا کہ بیشک متقی لوگ بہشتوں اور چشموں میں ہوں گے۔ ان کے رب نے ان کو جو کچھ عطا کیا ہوگا وہ اس کو لے رہے ہوں گے، وہ لوگ اس کے قبل نیکو کار تھے، وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور اخیر شب میں استغفار کیا کرتے تھے، اور ان کے مال میں سائل اور غیر سائل کا حق تھا، اور یقین لانے والوں کیلئے زمین میں بہت سی نشانیاں ہیں، اور خود تمہاری ذات میں بھی تو کیا تم کو دکھلائی نہیں دیتا۔ اور فرمایا: رسول اللہ ﷺ نے کہ اعمال کا دارومدار نیت پر ہے۔ اور حضرت جبرئیل کے سوال کے جواب میں کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ احسان اس کو کہتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اور قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، یہ تیسری قسم از روئے ماخذ تمام مقاصد شرعیہ میں دقیق اور باعتبار اصل، سب سے زیادہ گہری ہے۔ اور شریعت کے تمام احکام کے مقابلہ میں ایسی ہے جیسی روح جسم کے مقابلہ میں، اور اس فن کی کفالت حضرات صوفیاء رحمہم اللہ نے فرمائی۔ چنانچہ یہ حضرات پہلے خود ہدایت یاب ہوئے، پھر ہادی بنے، خود ہدایت حاصل کی اور دوسری کو ہدایت دی، خود پیا اور دوسروں کو پلایا، اور سعادت بلند پر فائز ہوئے اور بڑا نصیبہ پایا۔ اللہ ہی کے لئے ان کی خوبیاں ہیں، اللہ اکبر! ان کی افادیت کتنی عام ہے اور ان کا نور کتنا تام ہے۔

تصوف ایک اصطلاحی لفظ: ۔تصوف کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ تصوف ایک شرعی مقصد......جس کو حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی نے دینی احکام کیلئے بمنزلہ روح کے قرار دیا ہے......کا اصطلاحی عنوان ہے، عنوان سے بدکنا، اور اس کو ہدف اعتراض بنانا معقولیت سے بعید ہے۔

بات یہ ہے کہ دور رسالت میں تمام علوم وفنون دینیہ اور تمام اعمال شرعیہ کا سرچشمہ جناب نبی کریم ﷺ کی ذات مبارکہ تھی۔ آپ سے حضرات صحابہ نے اپنی اپنی استعداد کے مطابق کمالات علمیہ وعملیہ کی تحصیل کی، اور مختلف علوم میں امتیاز پیدا کیا، لیکن اس وقت علوم کیلئے الگ الگ عنوانات اور ان کے حاملین کیلئے الگ الگ نام متعین نہ ہوئے تھے۔ آپ کے تمام شاگردوں اور متوسلین کا ایک لقب تھا، یعنی صحابہ ان کے بعد جو لوگ آئے وہ تابعین ہوئے، پھر علوم میں امتیاز اور اس کیواسطے سے ان کے متخصصین میں امتیاز پیدا ہونے لگا، چنانچہ علم حدیث، علم تفسیر، علم فقہ، علم الانساب، پھر علم اسماء الرجال، علم اصول، علم کلام اور مختلف علوم الگ الگ عنوانات سے ظاہر ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ یہ تمام علوم سادہ اور ابتدائی شکل میں عہد نبوت میں موجود تھے، مگر جوں جوں ان کی تفصیلات مرتب ہوتی گئیں، ان کی تدوین ہوتی گئی، ان کے الگ الگ نام متعین ہوتے گئے۔ اور ان کے لحاظ سے ان کے ماہرین کے نام معروف ہوتے گئے۔ تو کیا چونکہ عہد نبوت میں یا عہد صحابہ میں یہ نام اور یہ القاب نہ تھے، اس لئے ان کو بدعت اور محدث قرار دے دیا جائے گا؟ اگر نہیں تو پھر اس تصوف ہی سے وحشت کیوں ہے؟ ہاں یہ دیکھ لینا چاہئے اور بغور سمجھ لینا چاہئے کہ جس علم یا جس عمل کا یہ عنوان مقرر ہوا ہے، اس کی اصل قرآن وسنت، عہد نبوی اور صحابہ میں موجود ہے یا نہیں؟ اگر دین کے اس معیار پر تصوف کا مصداق کھرا نہیں ثابت ہوتا تو بے شک یہ لائق رد اور قابل انکار ہے۔ لیکن اگر ایسا نہیں ہے، اس کے مقاصد واغراض کتاب وسنت سے ماخوذ اور اس کے وسائل وذرائع حد جواز کے اندر ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اس بنا پر انکار کر دیا جائے کہ کتاب وسنت میں اس نام کا پتہ نہیں۔ اگر ایسا وطیرہ عام کر دیا جائے تو بہت سے علوم

کوشریعت کے دائرے سے خارج کرنا پڑے گا۔

اس حقیقت کے مان لینے کے بعد اس بحث کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ تصوف کی وجہ تسمیہ کیا ہے، اس کا ماخذ اشتقاق کیا ہے؟ خواہ یہ صوف سے مشتق ہو کہ بیشتر اہل تصوف اپنے زہد وقناعت کی وجہ سے موٹے جھوٹے اور سادہ لباس پر اکتفا کرتے تھے، یا صفو سے اسے مشتق مانا جائے کہ تصوف میں صفائے قلب کا خاص اہتمام کیا جاتا ہے، بس اس کے مفہوم اور معنوں پر نگاہ کرنی چاہئے۔ پھر یہ بھی نہیں ہے کہ اس فن کا بس یہی ایک نام ہو، اہل تصوف نے اسے احسان سے بھی تعبیر کیا ہے جو خالص حدیث کا لفظ ہے، اسے طریقت بھی کہا ہے، جو شریعت کی پیروی کا راستہ ہے۔ اسے سلوک بھی کہتے ہیں کہ درحقیقت مرضیات الٰہی اور احکام شرع کی رہ نوردی ہے۔

تصوف کی حقیقت:۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ. (سورہ انعام)

تم کہہ دو کہ بالیقین میری نماز اور میری ساری عبادت اور میرا جینا اور میرا مرنا، یہ سب خالص اللہ ہی کیلئے ہے جو مالک ہے سارے جہان کا، اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھ کو اسی کا حکم ہوا، اور میں سب ماننے والوں میں پہلا ہوں۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

وَمَا اُمِرُوْا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰہَ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ حُنَفَاءَ وَ یُقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَیُؤْتُوا الزَّکٰوۃَ وَذٰلِکَ دِیْنُ الْقَیِّمَۃِ۔ (سورہ بینہ)

حالانکہ ان لوگوں کو یہی حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ اسی کیلئے خالص رکھیں دین کو یکسو ہو کر اور نماز کی پابندی رکھیں اور زکوٰۃ دیا کریں اور یہی طریقہ ہے درست مضامین کا۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ۔ (سورہ ذاریات)	میں نے جن وانس کو محض اپنی بندگی کیلئے پیدا کیا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں:

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اذْكُرُوْا اللّٰهَ ذِكْراً كَثِيْراً وَسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلاً۔ (سورہ احزاب)	اے ایمان والو! اللہ کو بہت کثرت سے یاد کرو اور صبح وشام اس کی پاکی بیان کرو۔

اس نوع کے مضامین قرآن پاک میں جا بجا بیان ہوئے ہیں۔ ان آیات پر غور کرنے سے حسب ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

(۱) انسان اور جنات کی تخلیق کا مقصد محض اللہ تعالیٰ کی بندگی اور عبادت ہے۔

(۲) عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہئے، اس میں کسی غیر کی شرکت نہیں ہونی چاہئے حتی کہ حظ نفس کے بھی شائبہ سے پاک ہونی چاہئے۔

(۳) عبادت اور بندگی کا یہ خلوص ساری زندگی میں جاری وساری رہنا چاہئے۔ عبادت کے جو متعینہ طریقے اور اوقات ہیں، وہ تو ہیں ہی، ان کے علاوہ زندگی کا ہر ہر لمحہ ہر حرکت وسکون اور ہر قول وفعل للّٰہیت کے رنگ میں ڈوبا ہوا ہونا چاہئے۔ زندگی بھی اسی ذات برحق کیلئے، اور موت بھی اسی محبوب حقیقی کیلئے۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم   خاکے شوم و بزیر پائے تو زیم
مقصود من خستہ زکونین توئی   از بہر تو میرم و از برائے تو زیم (۱)

---

(۱) حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء راوی ہیں کہ ان کے شیخ، شیخ الاسلام خواجہ فرید الدین گنج شکر قدس سرہ، ایک رات خاص حال اور کیفیت میں حجرۂ عبادت میں ٹہلتے تھے، اور یہ رباعی• نہایت درد وسوز کے ساتھ پڑھتے تھے اور سجدے کرتے تھے کم وبیش ایک ہزار سجدے کئے تھے۔ ان اللہ والوں کے دلوں میں محبت کی وہ آگ لگی رہتی تھی کہ ان کے پورے وجود کو پھونک کر رکھ دیتی تھی۔

میں رقص کرتا ہوں مست ہو کر مجھے وہ اپنا بنا رہے ہیں
جلے گی انکے سوا ہر اک شے، وہ آگ دل میں لگا رہے ہیں

آج ستم ظریف ان کی نیتوں پر شبہ کرتے ہیں۔ و سیعلم الذین ظلموا ای منقلب ینقلبون ۔
(مولانا محمد احمد پرتاب گڈھی)

میں چاہتا ہوں کہ ہمیشہ آپ کی محبت میں زندہ رہوں، مٹی ہو جاؤں، اور آپ کے پاؤں کے نیچے زندگی بسر کروں، مجھ خستہ کا مقصود ساری کائنات میں بس آپ ہیں، چاہتا ہوں کہ آپ کیلئے مروں اور آپ کیلئے جیوں۔

آپ تصوف کی چھوٹی بڑی تمام کتابیں جو معتبر ائمۂ صوفیہ نے لکھی ہیں، پڑھ جائیے، ان کے اقوال و فرمودات پر نظر ڈال لیجئے، ان کی زندگیوں کا مطالعہ کر لیجئے، سب کا حاصل اور خلاصہ یہی نکلے گا کہ اللہ کی عبادت ہو، خلوص اور یکسوئی کے ساتھ ہو، اور پوری زندگی اس کی بندگی و طاعت کے سانچے میں ڈھل جائے، بس بندہ کی تمام تر کوشش یہی ہو۔

اس جگہ حضرات صوفیہ کی تالیفات سے ایسے اقوال و عبارات نقل کئے جا سکتے ہیں جو مذکورہ بالا مضمون کی دلیل ہوں، مگر اسکی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات ایسی عیاں اور معروف ہے کہ اس کے لئے کسی حوالے کی ضرورت نہیں، تصوف کا ماحصل اور صوفیہ کی ساری تگ و دو کا حاصل بس یہی ہے کہ زندگی و موت کا محور رضائے باری تعالیٰ ہو جائے۔

یہاں ایک لمحہ غور کیجئے، جو کچھ تصوف کا مقصود ذکر کیا گیا ہے، جس پر تمام صوفیہ کا اتفاق ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اصل ایمان سے علیحدہ کوئی چیز ہے، درحقیقت یہی ایمان ہے، البتہ ایمان میں کبھی اضمحلال آجاتا ہے۔ اس پر نفسیانیت کی کدورتیں، اور غفلت کے گردوغبار چھا جاتے ہیں، معصیت کے امراض اسے ضعیف اور بے جان بنا دیتے ہیں، تو کوشش کی جاتی ہے کہ یہ کدورتیں، یہ گردوغبار اور یہ ضعف و اضمحلال دور کر کے اسے صاف ستھرا، قوی اور جاندار بنا دیا جائے، اسی کوشش اور جدوجہد کو عام اصطلاح میں تصوف سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اتباع سنت: یہاں اس بات کی وضاحت ضروری ہے کہ ایمان کی دولت ہمیں نبی اکرم محمد رسول اللہ ﷺ کے واسطے سے حاصل ہوئی ہے، ان پر ایمان لانا، ان کو واجب الطاعت ماننا، ان سے قلبی محبت و لگاؤ رکھنا، اور ان کے نقوش قدم پر چلنا، ایمان میں داخل ہے، حضور اکرم ﷺ پر ایمان اور ان کے اتباع کے بغیر اگر کوئی شخص چاہے کہ رضائے

باری تعالیٰ کو اپنی زندگی کا محور بنائے تو یہ ناممکن ہے۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَ یَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ (سورہ آل عمران)	تم کہہ دو کہ اگر تم اللہ تعالیٰ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ بھی تم سے محبت لگے گا، اور تمہارے گناہوں کی مغفرت کر دے گا، اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہیں۔
لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِمَنْ کَانَ یَرْجُوْ اللّٰهَ وَالْیَوْمَ الْآخِرَ وَذَکَرَ اللّٰهَ کَثِیْراً . (سورہ احزاب)	تمہارے واسطے رسول کی ذات میں بہترین نمونہ ہے اس شخص کیلئے جو اللہ کی اور یوم آخرت کی توقع رکھتا ہے اور اللہ کو بہت یاد کرتا ہے۔

حاصل یہ نکلا کہ مقصود اصلی اور مطلوب حقیقی تو اللہ تعالیٰ کی رضا و محبت ہے لیکن اس کا طریقہ سرکار نبوت ﷺ کی پیروی و اطاعت ہے پس انسان کی ساری کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اپنے کو نبی کے نقش قدم پر ڈال دے، اقوال و اعمال، افکار و نظریات، اعتقادات و جذبات، سیرت و کردار، ہر اعتبار سے ٹھیک ٹھیک نبی کا پیرو ہو، اس کے ساتھ یگانگت اور اتحاد پیدا کرلے ورنہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔

محال است سعدی کہ راہ صفا   تواں رفت جز بر پئے مصطفیٰ

سعدی! یہ بات محال ہے کہ حق کا راستہ بجز مصطفیٰ ﷺ کے پیروی کے اور کسی طرح چلا جا سکتا ہو۔

سعدی علیہ الرحمہ صوفیہ کے مستند ترجمان ہیں، تمام صوفیہ کا اس پر اتفاق ہے کہ دنیوی و اخروی تمام سعادات دامن مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ ہیں، اس کے بغیر سب ہیچ ہے۔

مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندی علیہ الرحمہ کا مقام جماعت صوفیہ میں بہت بلند ہے، وہ اپنے مکتوبات میں بار بار نہایت تاکید اور شد و مد کے ساتھ اتباع سنت کی ترغیب دیتے ہیں، اپنے ایک مکتوب میں اپنے مرشد گرامی خواجہ باقی باللہ علیہ الرحمہ کے فرزند خواجہ محمد

عبداللہ کوتحریرفرماتے ہیں کہ:

> نصیحتے کہ بہ فرزند اعزی و بسائر احبہ نمودہ می آید اتباع سنت سنیہ است علی صاحبہا الصلوٰہ والسلام والتحیۃ واجتناب از بدعت نا مرضیہ، سعادت مند کسے است کہ دریں غربت احیائے سنتے از سنن متروکہ نماید واماتت بدعت از بدع مستعملہ فرماید۔ ایں آں وقت است کہ ہزار سال از بعثت خیر البشر علیہ وعلیٰ آلہ الصلوٰۃ والسلام گزشتہ است، علامات قیامت پرتو انداختہ است وسنت بواسطۂ بعد عہد نبوت مستور شدہ است وبدعت بعلت افشاء کذب جلوہ گرگشتہ شاہبازے باید کہ نصرت فرماید وہزیمت بدعت نماید۔ بہمگی ہمت وتمامی نہمت متوجہ آں باید کہ ترویج سنتے از سنن نمودہ آید ورفع بدعتے از بدع کردہ شود۔ (مکتوب:۲۳ دفتر دوم ص:۵۸)

> **ترجمہ**: نصیحت جوفرزند عزیز اور تمام دوستوں کوبطور خاص کی جاتی ہے، وہ سنت سنیہ علی صاحبہا الصلوٰہ والسلام کی تابعداری اور بدعات ناپسندیدہ سے کلی اجتناب کی ہے، وہی شخص سعادت مند ہے جو اسلام کی غربت کے اس دور میں متروکہ سنتوں میں سے کسی سنت کوزندہ کرے، اور جاری بدعات میں سے کسی بدعت کوختم کرے۔ یہ وہ وقت ہے کہ حضرت خیر البشر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت پر ایک ہزار برس گذر چکے ہیں۔ قیامت اپنا سایہ ڈال رہی ہے، عہد نبوت سے بعد کی وجہ سے سنتیں پوشیدہ ہورہی ہیں، اور کذب کی شیوع کی وجہ سے بدعات جلوہ گر ہورہی ہیں، کوئی شاہباز چاہئے جوسنت کی نصرت کرے۔ اور بدعات کوشکست دے، پوری توجہ اور اہتمام سے اس پر متوجہ ہونا چاہئے کہ کسی سنت کی ترویج ہواور کسی بدعت کا خاتمہ ہو۔

خلاصہ :۔ اب تک کی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرات صوفیۂ کاملین اور مشائخ محققین کے نزدیک تصوف کا حاصل یہ ہے کہ جناب نبی اکرم ﷺ کا اتباع کامل، اس کے واسطے سے حق تعالیٰ کی رضا کا حصول ہو، یہی تصوف کی روح ہے، اور اس کی غایت ہے، اگر یہ بات کسی کوحاصل ہوتو اس نے تصوف کی روح پالی، خواہ وہ اس کے نام سے آشنا نہ ہو، اور جو اس سے محروم رہا۔ اس کوتصوف سے کوئی تعلق نہیں خواہ اسکوتصوف کی تمام اصطلاحیں ازبر ہوں، خواہ وہ تمام رسوم تصوف کوادا کرتا ہو، اور خواہ وہ خودکوزمرۂ صوفیہ میں شمار کرتا ہو۔

یہاں تک تصوف کی حقیقت اور اس کے مقاصد کے سلسلے میں اجمالی گفتگو کی گئی ہے۔ اب مناسب یہ ہے کہ اس سلسلے میں قدرے تفصیلی بات بھی ہو جائے تاکہ تصوف کے متعلق لاعلمی یا غلط فہمی کی وجہ سے جو شکوک وشبہات عموماً دماغوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ان کا تصفیہ ہو جائے، نیز اس باب میں علماء دیو بند...... جو سلسلہ تصوف کے مجدد ہوئے ہیں...... کا موقف بھی واضح ہو جائے۔

دین میں تصوف کا مقام :۔ اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر مرحلہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے، ولادت سے لیکر موت تک، جتنے اور جن احوال سے آدمی گزرتا یا گزر سکتا ہے، چلنا پھرنا، اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا، خرید وفروخت، معاملات واخلاق، دوستی ودشمنی، نکاح وطلاق، سیاست وحکومت، عبادت واطاعت، غرض ہر شعبۂ حیات کو اپنی کامل گرفت میں رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ شریعت اپنے آخری پیغمبر ﷺ پر نازل فرمائی ہے، اس طریقۂ حیات کے علاوہ اور کوئی دستور العمل معتبر اور لائق قبول نہیں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ ۔ (سورہ آل عمران)

اور جو شخص اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا طالب ہوگا تو وہ مقبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔

پوری شریعت اور پورے دین پر غائرانہ نظر ڈالئے تو اصولی طور پر شریعت پانچ اجزاء پر مشتمل نظر آتی ہے۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ارشاد فرماتے ہیں کہ:

> ”غور سے سن لیجئے، دین کے پانچ اجزاء ہیں، ایک جز تو عقائد کا ہے کہ دل سے اور زبان سے اقرار کرنا کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ نے جس چیز کی جس طور پر خبر دی ہے وہی حق ہے۔
>
> دوسرا جز عبادات ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ۔
>
> تیسرا جز معاملات ہیں، یعنی احکام نکاح وطلاق، حدود وکفارات، بیع وشراء،

اجارہ وزراعت وغیرہ۔ اور ان کے جزو دین ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت یہ سکھلاتی ہے کہ کھیتی یوں بویا کرو اور تجارت فلاں فلاں چیز کی کرو، بلکہ ان میں شریعت یہ بتاتی ہے کہ کسی پر ظلم نہ کرو، زیادتی نہ کرو اور اس طرح معاملہ نہ کرو جس میں نزاع اور جھگڑے کا اندیشہ ہو، غرض جواز وعدم جواز کا بیان کیا جاتا ہے۔

چوتھا جز معاشرت ہے، یعنی اٹھنا بیٹھا، ملنا جلنا، مہمان بننا، کسی کے گھر پر جانا کیونکر چاہئے، اس کے کیا آداب ہیں، بیوی بچوں، عزیزوں، اجنبیوں اور نوکروں وغیرہ کے ساتھ کیونکر برتاؤ چاہئے۔

پانچواں جز تصوف ہے جس کو شریعت میں اصلاح نفس کہتے ہیں۔ آج کل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تصوف کیلئے بیوی بچوں (اور دوسرے دنیاوی اور معاشرتی امور) کو چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ بالکل غلط ہے، یہ جاہل صوفیوں کا مسئلہ ہے، جو تصوف کی حقیقت کو نہیں جانتے۔

غرض دین کے پانچ اجزاء ہیں، ان پانچوں کے مجموعہ کا نام دین ہے، اگر کسی میں ایک جز بھی ان میں سے کم ہو، تو وہ ناقص دین ہے۔

(بصائر حکیم الامت ص: ۸۴ بحوالہ وعظ تفصیل الدین)

جس طرح جسم انسانی میں اگر کوئی عضو نہ ہو، یا ناقص ہو تو ایسا شخص حسن وجمال کے معیار پر پورا نہ اترے گا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کی دین داری مذکورہ پانچ اجزاء میں سے کسی ایک سے خالی ہو تو اس میں نقص کا رہ جانا ناگزیر ہے۔

اصلاح نفس کی اهمیت:

پھر غور کیجئے، اصلاح نفس یا تصوف جسے دین کا ایک جز بتایا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ پانچ اجزاء میں سے ایک جز ہی ہے، مکمل دین نہیں ہے، لیکن اس میں بھی ذرا تردد نہیں کہ یہ ایسا جز ہے جو باقی اور اجزاء کیلئے تکمیل وتزئین کا سامان ہے، اگر نفس کی اصلاح نہ ہو اور وہ

اپنی بہیمیت پر قائم رہے، اور شہوات وخواہشات میں ملوث رہے تو ہوسکتا ہے کہ دین کے باقی اجزاء وجود میں آتے رہیں، مگر نفس کی تلویثات کی وجہ سے وہ مکدر ہوتے رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا .

جس نے نفس کو پاک کرلیا وہ کامیاب اور جس نے اس کو خراب کرلیا وہ ناکام ہوا۔

دوسری جگہ ارشاد ہے۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَ نَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِىَ الْمَاْوٰى (سورہ نازعات) جو اپنے رب کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرا اور نفس کو اس کی خواہش سے روکا، اس کا مستقر جنت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ نفس، انسانی وجود کا وہ جز ہے جس میں بگڑنے اور فاسد ہونے کی استعداد اتنی زیادہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گویا اسے مطلقاً ''امارہ بالسوء'' برائی کا حکم دینے والا قرار دیا ہے، لیکن یہی نفس تزکیہ اور طہارت قبول کرلینے کے بعد نفس مطمئنہ بن جاتا ہے، جس میں دخول جنت کی ندا سننے کی استعداد پیدا ہوجاتی ہے۔ مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ نصیرالدین چراغ دہلوی فرماتے ہیں:

> نفس آدمی بمنزلہ درختے ست کہ بمدد ہوائے شیطانی در ذات ایں کس بیخ می گیرد ومحکم می شود، اگر آدمی بتدریج وسکونت بزور عبادت وتقوی وبقوت محبت وعشق ہر روز آں درخت را بہ جنباند ہر آئینہ بیخ او سست شود و قابل قلع گردد۔
>
> (نظام تعلیم وتربیت ج:۲ص:۱۱۵، بحوالہ سیر الاولیاء ص:۲۴۲)

آدمی کا نفس ایک درخت کی طرح ہے، شیطانی وساوس کی مدد سے اس میں بیج پڑتا ہے۔ پھر وہ درخت بن کر مضبوط ہوجاتا ہے۔ اگر انسان آہستہ آہستہ سنجیدگی سے عبادت و تقویٰ کے زور، اور محبت وعشق الٰہی کی قوت سے روزانہ اس درخت کو ہلاتا رہے گا تو یقیناً وہ سست پڑ جائے گا اور اکھاڑنے کے قابل ہوجائے گا۔

اور جب یہ درخت اکھڑ جاتا ہے تو آدمی کو احکام الٰہی کی پابندی میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوتی، بلکہ اس میں شوق وذوق کا اضافہ ہوکر حلاوت ولذت کی ایک جدید کیفیت شامل ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے پوری زندگی پر لطف اور کیف آفریں ہو جاتی ہے۔

گویا دین کی تکمیل کا مدار اصلاح نفس پر دو طریقوں سے ہے، ایک تو اس طرح کہ وہ خود شریعت کا ایک جز ہے، وہ نہ ہو تو اس میں ایک جز کی کمی رہ جاتی ہے۔ دوسرے اس طرح کہ باقی اجزاء کی کما حقہ تکمیل بھی اسی جز کے واسطے سے ہے، اس کے نہ ہونے سے ہر جزو میں کمی واضمحلال کو راہ مل جاتی ہے۔

تصوف کے اجزاء :۔ تصوف کوئی علمی اور تحقیقاتی فن نہیں ہے، بلکہ یہ ایک عملی اور تمرینی شعبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ صوفیہ، مریدین کے قیل وقال کو پسند نہیں کرتے، فرماتے ہیں کہ کام کرتے رہو، مقصود کام کرنا ہے، کلام کرنا نہیں ہے، صوفیہ کے مشہور شارح اور ترجمان خواجہ عزیز الحسن صاحب مجذوب نے فرمایا ہے کہ:

کامیابی تو کام سے ہوگی   نہ کہ حسن کلام سے ہوگی
ذکر کے التزام سے ہوگی   فکر کے اہتمام سے ہوگی

لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ عمل سے پہلے اس کا بقدر ضرورت علم ہو، تاکہ اعمال میں غلطی نہ ہو اس لحاظ سے، اور دوسرے فنون کی طرح تصوف کے بھی کچھ مبادی ومقدمات، کچھ مقاصد اور کچھ ثمرات وفوائد ہیں۔ ان میں عمل کے لحاظ سے اصل چیز تو مقاصد ہیں، لیکن ان کے حصول کیلئے کچھ ابتدائی تمہیدات اور بنیادی مقدمات ہوتے ہیں، جن کو بروئے کار لائے بغیر مقصد کا حصول نہیں ہوتا، پھر مقاصد کو عمل میں لانے کے بعد ان کے کچھ ثمرات و فوائد حاصل ہوتے ہیں، ان ثمرات میں سے بعض تو مطلوب بھی ہوتے ہیں، اور محمود بھی، اور بعض صرف محمود ہوتے ہیں، ان کا حصول مطلوب نہیں ہوتا۔ اس کی قدرے تفصیل حکیم الامت حضرت تھانوی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

’’ہر مطلوب میں کچھ مبادی ہوتے ہیں، کچھ مقاصد، کچھ زوائد وتوابع۔ اصل

مقاصد ہوتے ہیں اور مبادی ان سے مقدم ہوتے ہیں۔ مگر مقصود بالعرض۔ (۱) اور زوائد ان سے موخر مگر غیر مقصود ہوتے ہیں، اسی طرح اس طریق میں بعض مبادی ہیں، وہ چند علوم و مسائل ہیں۔ جو موقوف علیہ ہیں، بصیرت فی المقصو د کیلئے، اور بعض مقاصد ہیں کہ وہی مقصود بالتحصیل ہیں، اور انہیں پر مدار ہے کامیابی اور ناکامی کا، اور بعض زوائد ہیں کہ ان کا وجود نہ معیار کامیابی ہے اور نہ فقدان معیار ناکامی۔

منجملہ مبادی کے امر اول مذکورہ بالا ہے۔ (یعنی چند علوم و مسائل) جو غالباً اعظم المبادی اور اجمع المبادی ہیں اور مقاصد اعمال خاصہ ہیں، جو کہ افعال اختیاریہ ہیں، جن میں ایک حصہ اعمال صالحہ متعلق بجوارح ہے۔ (یعنی ایسے اعمال جن کا تعلق اعضاء ظاہرہ سے ہے) جن کو سب جانتے ہیں۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ و دیگر طاعات واجبہ و مندوبہ۔ اور دوسرا حصہ اعمال صالحہ متعلق بقلب و نفس ہے۔ مثل اخلاص و تواضع و حب حق و شکر و صبر و رضا و تفویض و توکل و خوف و رجا و امثالہا اور ان کے اضداد کا ازالہ، اور ان اعمال اختیاریہ کو مقامات کہتے ہیں، اور یہی نصوص میں مامور بالتحصیل ہیں (یعنی قرآن و حدیث میں ان کے حاصل کرنے کا حکم ہے) اور ان کے اضداد مامور بالازالہ بمعنی الکف والردع ہیں (یعنی افعال مذکورہ کی ضد جو اعمال و افعال ہیں، انہیں ترک کرنے کا حکم ہے) اور ان اعمال کی غایت تعلق بحق و رضائے حق ہے کہ روح اعظم سلوک و تصوف کی یہی ہے، اور زوائد احوال خاصہ ہیں مثل ذوق و شوق، قبض و بسط، صحو و سکر، غیبت و وجد اور استغراق و اشباہہا اور یہ امور غیر اختیاریہ ہیں، اعمال مذکورہ پر اکثر ان کا ترتب ہوتا ہے اور گاہ نہیں ہوتا۔ یہ احوال نہ مامور بہا ہیں اور نہ ان کے اضداد مامور بالازالہ، اگر ترتب ہو جائے تو محمود ہے، اور اگر نہ ہو تو مقصود میں کچھ خلل نہیں، اسی لئے کہا گیا ہے کہ **المقامات مکاسب والاحوال مواہب** (مقامات کو

---

(۱) مقصود بالعرض کا مطلب یہ ہے کہ خود وہ چیز مطلوب نہیں ہے۔ لیکن چونکہ حصول مقصود کیلئے ضروری ہے، اس لئے اس کا برتنا ضروری ہے۔ مثلاً کھانے کیلئے برتن، چولہا بذات خود مطلوب نہیں ہے لیکن اس کے حصول کا ذریعہ ہے۔ اس لئے وہ مقصود بالعرض ہے

حاصل کیا جاتا ہے اور احوال عطیۂ خداوندی ہیں)

پس خلاصہ یہ ہوا کہ طریق میں تین امر مبحوث عنہ ہیں:

(۱) علوم جن سے مقصود میں بصیرت حاصل ہوتی ہے۔

(۲) اور اعمال جو کہ مقصود ہیں اور انہیں کا اہتمام ضروری ہے۔

(۳) اور احوال جو کہ مقصود نہیں ہیں، گو محمود ہیں، ان کے درپے ہرگز نہیں ہونا چاہئے۔ (بصائر حکیم الامت بحوالہ تربیت السالک، ص:۷۰۳)

مقاصد تصوف:۔ تصوف کے مقاصد جن کا ذکر اوپر ہوا اور جنہیں اصطلاح میں مقامات کہا جاتا ہے، ان کے مطلوب و مامور ہونے میں کسی مسلمان کو کلام نہیں ہوسکتا۔ حضرت تھانویؒ نے اس کے دو شعبے بیان فرمائے ہیں۔ ایک شعبہ وہ ہے جو اعضائے ظاہرہ سے متعلق ہے۔ مثلاً نماز، روزہ، حج وزکوٰۃ اور دوسری طاعات ہیں، ان میں جو کچھ فرض ہے، وہ تو ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ البتہ ان میں جو کچھ نوافل ہیں، ان کی تکثیر اور ان کا اہتمام مقربین اور اصحاب سلوک کا وظیفہ ہے۔ لیکن تصوف میں زیادہ اہتمام ان اعمال کا ہوتا ہے۔ جن کا تعلق قلب سے ہے۔ جن کے حاصل ہونے کے بعد اول الذکر اعمال میں جان پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں وارد ہے کہ:

الا ان فی الجسد لمضغة اذا صلحت صلح الجسد كله و اذا فسدت فسد الجسد كله الا وھی القلب۔	سنو! بدن میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے جب وہ درست ہوتا ہے تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور جب وہ بگڑتا ہے تو سارا بدن بگڑ جاتا ہے۔ سنو! وہ دل ہے۔

نماز ہر شخص پڑھتا ہے، لیکن اگر اس میں قلب کا عمل یعنی خشوع شامل نہیں ہے تو نماز عبادت کا ظاہری ڈھانچہ بن کر رہ جائے گی۔ اس نماز سے فریضۂ الٰہی از روئے فقہ ظاہری تو اتر جائے گا مگر اس پر اس فلاح کی ضمانت نہیں ہے، جس کی طرف اذان میں حی علی الفلاح کہہ کر دعوت دی جاتی ہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے:

قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِيۡ کامیاب ہوئے وہ مومن جو اپنی نماز میں
صَلَاتِهِمۡ خَاشِعُوۡنَ۔ صاحب خشوع ہیں۔

ہم اس جگہ چاہتے ہیں کہ مقاصد تصوف کی تفصیل بقدر ضرورت کر دیں، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ جس تصوف کی مخالفت آج کل ایک فیشن بن گئی ہے، وہ انسان کو کن بلندیوں تک پہونچانا چاہتا ہے اور اس سے محروم ہو کر لوگ کن پستیوں میں جا پڑے ہیں۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی جماعت علماء و مشائخ دیوبند کے سرخیل ہیں، جو ایک طرف باکمال محدث اور زبردست فقیہ ہیں تو دوسری طرف اعلیٰ درجہ کے صوفی اور شیخ طریقت بھی ہیں، جن کے فیض صحبت سے علماء ربانیین کی ایک بڑی تعداد وجود میں آئی۔ اور جن کے انفاس قدسیہ کی برکت سے برسوں کی نہیں، بلکہ صدیوں کی جمی جمائی بدعات کا خیمہ اکھڑ گیا۔ ان کی ایک مختصر تحریر اس موضوع پر عربی زبان میں تذکرۃ الرشید میں مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی مرحوم نے نقل کی ہے۔ اصل عبارت نقل کرنے میں ذرا طوالت ہے۔ تذکرۃ الرشید میں ملاحظہ فرمالیں۔ یہاں ترجمہ ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) **علم صوفیہ** : نام ہے علم دین کا خواہ ظاہری ہو یا باطنی اور قوت یقین کا، اور یہی علم اعلیٰ ہے۔

(۲) **حال صوفیہ**: اخلاق کا سنوارنا اور ہمیشہ خدا کی طرف لو لگائے رکھنا۔

(۳) **حقیقت تصوف** : اللہ تعالیٰ کے اخلاق کے ساتھ مزین ہونا، اپنے ارادہ کو ترک کرنا اور بندے کا اللہ تعالیٰ کی رضا میں بالکلیہ محو ہو جانا۔

(۴) **اخلاق صوفیہ** :۔ وہی ہیں جو جناب رسول اللہ ﷺ کے اخلاق ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: وَاِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِيۡم ۔ بیشک تم بڑے خلق پر فائز ہو نیز جو کچھ حدیث میں آیا ہے اس پر عمل کرنا۔

صوفیہ کے اخلاق کی تفصیل یہ ہے:

(۱) اپنے آپ کو کمتر سمجھنا، اس کی ضد تکبر ہے۔ (۲) مخلوق کے ساتھ لطف و مہربانی کے

ساتھ پیش آنا اور خلقت کی ایذاؤں کا برداشت کرنا (۳) نرمی اور خوش خلقی کے ساتھ معاملہ کرنا، غیظ وغضب سے بچنا (۴) ہمدردی اور دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دینا، مخلوق پر فرط شفقت کی وجہ سے، جس کا مطلب یہ ہے کہ مخلوق کے حقوق کو اپنے نفسانی حظوظ پر مقدم رکھا جائے، (۵) سخاوت کرنا (۶) درگزر اور خطا کا معاف کرنا (۷) خندہ روئی اور بشاشت سے پیش آنا (۸) سہولت اور نرم پہلو رکھنا۔ (۹) تصنع اور تکلف سے پرہیز کرنا۔ (۱۰) خرچ بلا تنگی اور اسراف کے کرنا (۱۱) خدا پر بھروسہ رکھنا (۱۲) تھوڑی دنیا پر قناعت کرنا (۱۳) پرہیزگاری اپنانا (۱۴) جنگ وجدل اور عتاب نہ کرنا، مگر کسی حق کی بنیاد پر (۱۵) بغض وکینہ و حسد نہ رکھنا (۱۶) مال وجاہ کا خواہش مند نہ ہونا (۱۷) وعدہ کی پابندی کرنا (۱۸) بردباری (۱۹) دور اندیشی (۲۰) بھائیوں کے ساتھ موافقت ومحبت رکھنا اور اغیار سے علیحدہ رہنا (۲۱) محسن کی شکرگزاری اور (۲۲) جاہ کا مسلمانوں کے فائدے کیلئے استعمال کرنا۔

صوفی اخلاق میں اپنا ظاہر وباطن مہذب بناتا ہے، اور تصوف سارا ادب ہی کا نام ہے۔ (کس ادب کا؟) بارگاہ احدیت کا ادب اور حق تعالیٰ کے جلال وہیبت کی وجہ سے از روئے حیا، ماسوی اللہ سے اعراض کرنا، حدیث نفس (یعنی ہمہ وقت نفس کی گفتگو میں مشغول رہنا) بدترین معصیت اور ظلمت کا سبب ہے۔ (تذکرۃ الرشید ج:۲ص:۱۱)

غور کر لیجئے، ان مقاصد میں کوئی بات اہل ایمان کیلئے نہ مبہم ہے اور نہ اجنبی کہ اس کی تشریح وتعریف ضروری ہو، البتہ قوت یقین جس کو مولانا نے علم اعلیٰ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کی قدرے وضاحت کردینی مناسب ہے۔

قوت یقین:۔ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات از قبیل امور غیب ہیں، اور انسان کے ادراک وحواس کی قوت عالم شہود سے متعلق ہے، پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے اوپر ایسا یقین حاصل ہو اور اس کے ساتھ ایسا قوی تعلق وارتباط پیدا ہو کہ اس کی وجہ سے مشاہدات کا یقین اور دنیا کی چیزوں کا تعلق مضمحل اور ماند پڑ جائے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہر شخص خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اس مادی

جسم کے ساتھ جو عناصر اربعہ سے مرکب ہے ۔ ایک غیر مادی چیز بھی جوڑ رکھی ہے، جس کا تعلق بنیادی طور پر جسم کے ساتھ کم اور عالم غیب کے ساتھ زیادہ ہے۔ وہ روح ہے۔ اور جس طرح محسوس چیزوں کے ادراک وعلم کیلئے اللہ تعالیٰ نے جسم انسانی میں مختلف اعضاء بنا کر ان میں احساس کی طاقت رکھ دی ہے۔ مثلاً آنکھ میں دیکھنے، کان میں سننے، زبان میں ذائقہ، ناک میں سونگھنے، اور کھال میں چھونے کی طاقت رکھ دی ہے۔ اسی طرح عالم غیب کی چیزوں کے ادراک کیلئے اللہ تعالیٰ نے روح کو بھی جسم کا ایک حصہ عطا فرمایا ہے۔ اور اس میں امور غیبیہ کے ادراک کی قوت ودیعت فرمادی ہے۔ اس کا نام ''قلب'' ہے۔

پھر ہر شخص یہ بھی بخوبی جانتا ہے کہ جس حاسہ سے کام لیا جاتا رہے گا وہ اپنا فریضہ با قاعدہ انجام دیتا رہے گا اور جس حاسہ کو معطل کر دیا جائے، رفتہ رفتہ اس کی طاقت ضعیف ہوجاتی ہے۔ مثلاً اگر نگاہ کو معطل کر دیا جائے، ہمیشہ آنکھ پر پٹی بندھی رہے، اور اس سے کام نہ لیا جائے تو زیادہ مدت نہیں گزرے گی، کہ بصارت ضعیف ہوجائے گی ۔ اور ایک عرصہ میں بالکل زائل ہوجائے گی۔

بعینہ یہی حال قلب کا بھی ہے۔ اگر اسکو امور غیبیہ کے ساتھ جوڑے رکھا گیا اور اس کے موانع کے دور کرنے کا اہتمام کیا گیا تو اس کو غیبی امور کے ساتھ مناسبت قوی ہوتی جائے گی، یہاں تک کہ یہ اپنی قوت کی وجہ سے تمام حواس ظاہرہ پر غالب آجائے گا۔ اور غیبی امور کے ساتھ اس کے تعلق کی ترتیب یہ ہے کہ اللہ کا ذکر بکثرت کیا جائے، ذکر کا اصل محل قلب ہے، مگر اس میں ذکر جاگزیں کرنے کیلئے زبان سے کام لینا پڑتا ہے۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ ذکر کے دل میں راسخ ہونے سے جو چیزیں مانع ہیں، ان سے علی حسب مراتب اور بقدر ضرورت اجتناب کیا جائے تا کہ اللہ کی یاد دل میں بیٹھ کر حضوری کی کیفیت پیدا کردے، اس مرتبہ میں پہونچ کر آدمی کو یقین کی قوت حاصل ہوتی ہے۔

حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ نے اس حقیقت کو سمجھانے کیلئے ایک بار ارشاد فرمایا کہ:

> ''تمام اذکار واشغال ومراقبات وغیرہ کا خلاصہ ہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ کی حضوری ہر وقت میسر رہے، بعض نے اس حضوری کے دو درجے کر دیئے ہیں جن میں ایک یہ ہے کہ اسم ذات مخیلہ (قوت خیال) میں قائم ہو جائے۔ پھر اس سے مسمیٰ (یعنی ذات حق) کی طرف بآسانی راستہ مل جاتا ہے، (اور یہی دوسرا درجہ ہے) یہ جو بزرگوں نے چلہ وغیرہ کا طریقہ ایجاد کیا ہے۔ اس کا یہی مطلب تھا کہ کوئی دوسرا نقش وخیال مخیلہ پر نہ پڑے، مثلاً باہر نکلو تو گھونگھٹ کر کے نکلو کہ کسی کو دیکھو گے تو اس کی صورت کا نقش مخیلہ کو مکدر کر دے گا۔ جس طرح انسان کو اپنی ہستی کا ہمہ وقت علم ہے کہ ''میں ہوں'' بس ایسا ملکہ بلکہ یہی علم حق تعالیٰ کے ساتھ رہنا چاہئے فرق اتنا ہے کہ اپنے تیئں جسم، صورت شکل، آنکھ، ناک، کان کے ساتھ مشاہدہ کرتا ہے۔ حق تعالیٰ کو بدوں اس کے مشاہدہ کرے کہ وہ ہے۔ ؎
>
> دور بینان بارگاہ الست　　غیر ازیں پے نبردہ اند کہ ہست
>
> حق تعالیٰ کی بارگاہ کے جو دور بیں حضرات ہیں، ان کی رسائی اسی قدر ہے کہ ''وہ ہے''
> (اس سے زیادہ ان کی بھی رسائی نہیں ہے)
>
> کے یہی معنی ہیں، اور النهاية راجعة الى البداية کا یہی مطلب ہے، کہ جس طرح نوزائیدہ بچہ جانتا ہے کہ ''اللہ ہے'' بس یہی قائم ہو جانا سب کچھ ہے۔ انسان کسی وقت اپنی ہستی کو بھی بعض مصروفیت میں فراموش کر دیتا ہے، لیکن یہ فراموشی نہایت خفیف اور کالعدم ہوتی ہے۔
>
> پہلے بزرگ اخلاق سیئہ کو چھڑانے کی محنتیں کرایا کرتے تھے، تاکہ یہ کام آسان ہو جائے، مگر متاخرین نے خصوصاً ہمارے سلسلے کے بزرگوں نے یہ طریق پسند کیا ہے کہ ذکر اس قدر کثرت سے کرے کہ یہ اخلاق ذکر کے نیچے دب جائیں اور ذکر تمام باتوں پر غالب آجائے۔ (تذکرۃ الرشید ج:۲، ص:۱۲)

اذکار واشغال پر مفصل گفتگو تو آگے آرہی ہے، لیکن اس تحریر سے معلوم ہوا کہ

مقاصد تصوف میں اعظم مقصد جو علم اعلیٰ ہے، وہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی حضوری حاصل ہو جائے ،حقیقت کے لحاظ سے خدا تعالیٰ بندے کے ساتھ ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ (الحدید) تم جہاں بھی ہو وہ تمہارے ساتھ ہے۔

بلکہ وہ تو شہ رگ سے زیادہ قریب ہے۔

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ (سورہ ق) ہم آدمی کے اس شہ رگ سے زیادہ قریب ہیں۔

یہ حقیقت باوجود یکہ ایک امر محکم ہے، مگر انسان اس سے عموماً غافل رہتا ہے اس غفلت کا علاج ''ذکر کثیر'' ہے۔ اور اس کے اثر کرنے کی شرط، موانع کا انسداد ہے، ذکر کثیر کے بعد اس حضوری اور معیت کا راسخ علم بندے کو حاصل ہوتا ہے۔ اس حضوری کے دو درجے ہیں۔ اور یہ دونوں درجے الگ الگ استعدادوں کیلئے ہیں، کبھی تو اللہ تعالیٰ کے نام کو ذکر کثیر کے ذریعے انسان کے دل میں، دماغ میں، خیال میں نقش کر دیا جاتا ہے، چنانچہ ذاکر کو باری تعالیٰ کے نام کا استحضار کامل حاصل ہو جاتا ہے۔ یہ پہلا درجہ ہے، پھر اس خیال کو اسم سے مسمیٰ اور ذات کی طرف منتقل کر دیا جاتا ہے۔ یہ دوسرا درجہ ہے، اور یہی اصل مقصود ہے، اور جن کی استعداد اعلیٰ ہوتی ہے۔ ان کو پہلے درجہ کی حاجت نہیں ان کو براہ راست ذات حق کی حضوری حاصل ہو جاتی ہے۔

مقاصد تصوف پر ایک نظر پھر ڈال لیجئے۔ ان میں سے کون سی بات قابل اعتراض ہے۔ جس سے ہمارے بہت سے بھائی بدک رہے ہیں، بلکہ سچ پوچھئے تو حلاوت ایمان (۱) جس کا حدیث میں تذکرہ کیا گیا ہے اور جو منجملہ انعامات الٰہیہ کے ہے۔ اس کا حصول انہیں مقاصد کے حصول پر موقوف ہے۔ واللہ الموفق۔

مبادی تصوف :۔ ترتیب کے لحاظ سے مبادی اور تمہیدات کا ذکر پہلے آنا

---

(۱) حاشیہ اگلے صفحہ پر

چاہئے تھا لیکن چونکہ مبادی کی اہمیت، مقاصد کی اہمیت پر موقوف ہے، کیونکہ مبادی مقصود نہیں ہوتے، حصول مقصود کے ذرائع ہوتے ہیں۔ مقصد جتنا رفیع اور وقیع ہوگا، اس کے مبادی ومقدمات اسی کے بقدر مہتم بالشان ہوں گے، اسلئے پہلے مقاصد پر گفتگو کی گئی۔ مقصد کی عظمت وجلالت کا جب انکشاف ہوگیا تو ظاہر ہے کہ جن ذرائع سے اس کا حصول ہوگا، ان کو بجالانا کس قدر ضروری ہوگا۔ مقصد تصوف کی تحصیل کیلئے جو ضروری مقدمات درکار ہیں۔ ان کو ہم تین بنیادی عنوانات پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ (۱) بیعت وصحبت (۲) ریاضت ومجاہدہ (۳) اذکار واشغال ومراقبات۔

بیعت و صحبت: جہاں تک انسانی طبیعت کا معاملہ ہے، ہر زمانے کے عقلاء کا اس امر پر اتفاق ہے کہ انسانی طبیعت کے بناؤ اور بگاڑ میں جس قدر صحبت ومعیت کا

(حاشیہ صفحہ گذشتہ کا) **عن انس رضی الله عنه قال قال رسول الله ﷺ ثلث من کن فيه وجدبهن حلاوة الايمان، من كان الله ورسوله احب اليه مما سواهما ومن احب عبداً لا يحبه الا الله ومن يكره ان يعود فی الكفر بعد ان انقذه الله منه كما يكره ان يلقى فی النار** (بخاری ومسلم) تین باتیں جس میں ہوں گی اسے ایمان کی حلاوت نصیب ہوگی۔ ایک یہ کہ اللہ اور اس کے رسول، دنیا کی ہر شے سے زیادہ اسے محبوب ہوں۔ دوسرے یہ کہ اگر کسی سے محبت رکھے تو محض اللہ کے واسطے محبت کرے، تیسرے یہ کہ کفر میں لوٹنا اس کے نزدیک آگ میں گرنے کی طرح ہولناک بن جائے۔ حلاوت ایمان کیا ہے؟ امام نووی اس کا جواب دیتے ہیں۔ **استلذاذ الطاعات**، طاعات سے لذت یاب ہونا، **و تحمل المشاق فی رضی الله عزوجل و رسوله**، اللہ اور اسکے رسول کی رضامندی کیلئے دشواریوں کو جھیلنا، **ايثار ذلک علی عرض الدنيا**، اور متاع دنیا پر اسے ترجیح دینا۔ **ومحبة العبد ربه وسبحانه و تعالىٰ بفعل طاعته و ترک مخالفته و كذلک محبة رسول الله ﷺ** اور بندے کا اپنے رب سے محبت کرنا اس طرح کہ اس کی اطاعت میں سرگرم رہے، اور اسکی خلاف ورزی سے بچتا رہے۔ اور اسی طور پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی محبت رکھے، ہم نے جن مشائخ صوفیہ جو واقعی تصوف کے صحیح نمائندے تھے کی سیرتوں کا مطالعہ کیا ہے، یا ہمیں ان کی صحبت میں رہنے کا اتفاق ہوا، ان کے پاس اس حلاوت ایمانی کے جتنے نمونے ہم نے دیکھے، کہیں اور دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ **كثر الله امثالهم**.

دخل ہے، اتنا کسی اور چیز کو دخل نہیں ہے۔ یہ ایک ایسا بدیہی اور فطری مسئلہ ہے جس پر کسی دو شخص کی رائے مختلف نہ ہوگی۔ قرآن سے، حدیث سے، اقوال علماء سے حتی کہ عام انسانی افراد سے یہ بات اس قدر محقق ہے کہ اس کیلئے کسی طرح کا ثبوت پیش کرنا تحصیل حاصل اور طول لاطائل ہے۔ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی ساری فضیلت وکمال کا راز اسی ایک بات میں ہے کہ ان کو جناب نبی کریم ﷺ کی صحبت ومعیت ایمان وعقیدت کے ساتھ حاصل ہوئی تھی، اگر کسی کو یہ صحبت حاصل نہیں ہے تو وہ ایمان وعمل کے خواہ کتنے اونچے درجے پر فائز ہو باتفاق امت اسے کسی صحابی کے مقابل میں نہیں رکھا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ کا دستور یہی ہے کہ جس کسی کو کوئی کمال حاصل ہوتا ہے، وہ کسی صاحب کمال ہی کی صحبت میں حاصل ہوتا ہے۔ حضرات صوفیہ نے اس اصول کے پیش نظر طریق کا مدار صحبت پر رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی معلوم ومسلّم ہے کہ نری صحبت بلاتعلق ومحبت اور بغیر اعتقاد وانقیاد کے مفید ومؤثر نہیں ہوتی، اسلئے یہ حضرات فرماتے ہیں کہ جس شخص کو کوئی دینی کمال اور تقویٰ کا حسن وجمال حاصل کرنا ہو، وہ کسی صاحب کمال اور متقی وخوش خصال کو تلاش کرے۔ اس سے عقیدت ومناسبت ہو تو اس کی صحبت میں رہے، اس سے علم وعمل سیکھے، اس طریقے سے اسے کمال حاصل ہوتا چلا جائے گا۔

تجربہ یہی ہے کہ جو کچھ کسی کو حاصل ہوا ہے، اسی طریقے سے حاصل ہوا ہے۔ دنیاوی علوم وفنون اور اعمال واشغال میں بھی یہی دستور کارفرما ہے، اگر کسی کو تجارت کرنی ہے تو تاجروں کی صحبت میں رہ کر سیکھے۔

صحبت کی تاثیر:- مشہور ہے کہ کسی جوہری کا انتقال ہونے لگا۔ اس کا بچہ ابھی چھوٹا تھا، اس نے ایک صندوق میں جواہرات اور انہیں کے ہم شکل اور ہم رنگ پتھر کے ٹکڑے رکھ دیئے، اور ایک رقعہ پر وصیت تحریر کی کہ اس صندوق میں جواہرات ہیں اور انہیں کے ہم رنگ پارہائے سنگ رکھے ہوئے ہیں۔ بڑے ہونے کے بعد تم اسے فلاں شخص کے پاس جو میرا دوست اور جوہری ہے، لے جاکر اسے دکھانا، وہ شناخت کرکے تمہیں اصل

جواہرات حوالے کردے گا شعور کی عمر کو پہونچنے کے بعد یہ لڑکا صندوق لیکر اپنے باپ کے دوست کے پاس پہونچا اور اسے وصیت نامہ دکھایا، اس جوہری نے وصیت نامہ اور جواہرات اور سنگ ریزوں کو دیکھ کر کہا کہ میں یونہی چھانٹ کر جواہرات تم کو نہیں دے سکتا۔ اس کی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ میری دکان پر تم پانچ سال تک کام کرو، اس نے پانچ سال تک کام کیا، ان پانچ برسوں میں اسے جواہرات کی مکمل شناخت حاصل ہوگئی۔ اب اس نے صندوق منگوایا اور قفل کھول کر کہا کہ اب تم خود پہچان لو، اگر میں اسی وقت تمہیں دے دیتا تو جواہرات تو تمہیں مل جاتے لیکن نہ تم کو جواہرات کا علم حاصل ہوتا، اور نہ ان کی قیمت معلوم ہوتی، اس حکایت سے صحبت کی اہمیت کا خوب اندازہ ہوتا ہے۔

صحبت کی برکت:۔ حکیم الامت حضرت تھانوی لکھتے ہیں کہ:

> ”بھلا نری کتابوں سے بھی کوئی کامل و مکمل ہوا ہے، موٹی بات ہے کہ بڑھئی کے پاس بیٹھے بغیر کوئی بڑھئی نہیں بن سکتا، حتی کہ بسولہ بھی بطور خود ہاتھ میں لے کر اٹھائے گا تو وہ قاعدے سے نہ اٹھایا جائے گا۔ بلا درزی کے پاس بیٹھے سوئی پکڑنے کا انداز بھی نہیں آتا، بلا خوش نویس کے پاس بیٹھے، اور بلا قلم کی گرفت اور کشش دیکھے ہرگز کوئی خوش نویس نہیں ہوسکتا۔ غرض بدون کامل کی صحبت کے کوئی نہیں بن سکتا۔

(شریعت وطریقت، ص:۶۹، بحوالہ تصوف وسلوک ص:۱۱۱)

صحبت صالح ترا صالح کند   صحبت طالح ترا طالح کند
ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا   گو نشنید در حضور اولیاء
یک زمانہ صحبتت با اولیاء   بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
صحبت نیکاں اگر یک ساعت است   بہتر از صد سالہ زہد وطاعت است

نیک آدمی کی صحبت تم کو نیک بنادے گی، اسی طرح بد بخت کی صحبت تم کو بد بخت بنا دے گی۔ جو شخص خدا کی ہم نشینی کا طالب ہو تو اس کو اولیاء کی صحبت میں بیٹھنا چاہئے، اللہ والوں کی تھوڑی دیر صحبت سو سالہ طاعت بے ریا سے بہتر ہے۔ نیکوں کی صحبت اگر گھڑی بھر

نصیب ہو جائے تو وہ سو سالہ زہد و طاعت سے بہتر ہے۔

ساعت کا مطلب: ۔کامل کی صحبت میں بعض اوقات کوئی گر ہاتھ آجاتا ہے، یا کوئی حالت ایسی قلب میں پیدا ہو جاتی ہے، جو ساری عمر کیلئے مفتاح سعادت بن جاتی ہے۔ ہر وقت ہر ساعت مراد نہیں ہے بلکہ وہی قوت اور وہی ساعت مراد ہے، جس میں یہ حالت میسر ہو، تاہم ہر صحبت میں اس خاص بات کا احتمال ہے۔ اس لئے ہر صحبت کا اہتمام کرنا چاہئے۔ اس سے ہر صحبت کا مفید اور نافع ہونا ظاہر ہے۔ اور اس حالت کو صد سالہ ساعت کے قائم مقام بتلانے کی ایسی مثال ہے، کہ اگر کسی کے پاس سو اشرفیاں ہوں۔ تو بظاہر اس کے پاس اسباب اور سامان کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر ذرا تعمق کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ہر چیز اس کے قبضے میں ہے، کیوں کہ اشرفیوں سے اسباب خریدا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر اس کے اندر وہ کیفیت پیدا ہو تو بظاہر خاص طاعات میں سے اس کے پاس کچھ نہیں ہے مگر حکماً ہر چیز ہے۔ (شریعت وطریقت ص:۶۹)

شیخ کی صحبت میں طالب پوشیدہ طور پر آہستہ آہستہ اپنے اندر اخلاق حمیدہ کو جذب کرتا رہتا ہے۔ بالآخر وہ اعلیٰ درجہ کا صاحب اخلاق بن جاتا ہے۔ صحبت نیکاں کے متعلق شیخ سعدی علیہ الرحمہ کا یہ قطعہ بہت عجیب اور مناسب ہے۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے　　رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری　　کہ از بوئے دل آویز تو مستم
بگفتا من گل ناچیز بودم　　ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہم نشیں در من اثر کرد　　وگر نہ من ہماں خاکم کہ ہستم

ترجمہ: ایک روز حمام میں ایک محبوب کے ہاتھوں سے ایک خوشبودار مٹی مجھ کو ملی، میں نے اس سے پوچھا کہ تو مشک ہے یا عنبر، کہ تیری دل آویز خوشبو سے میری طبیعت مست ہوگئی۔ وہ بولی کہ میں ایک ناچیز اور معمولی مٹی تھی۔ مگر ایک مدت تک پھول کی صحبت میں رہی ہوں، اسی ہم نشین کے جمال نے مجھ میں اثر کیا ہے ورنہ میں تو وہی مٹی ہوں جو پہلے تھی۔

بیعت :۔ حضرات مشائخ اور صوفیہ جب کسی سالک اور مرید کو اپنے حلقۂ ارادت میں داخل کرتے ہیں، اور آئندہ معصیت نہ کرنے کا عہد لیتے ہیں، اور معصیت ہو جانے کی صورت میں توبہ کر لینے کا وعدہ کراتے ہیں، نیز اعمال صالحہ پر استقامت اور سنت وشریعت کے اتباع کامل کا معاہدہ کراتے ہیں۔ یہ سارے کام تو خود مرید اور سالک کے کرنے کے ہیں۔ لیکن انسانی فطرت ہے کہ اپنے کسی عمل پر دوسرے کو گواہ بنا لیا جاتا ہے، تو اس میں پختگی آجاتی ہے، اور اس کا اہتمام بڑھ جاتا ہے۔ ایک شخص جب اپنے شیخ ومرشد کے ہاتھ پر توبہ کرتا ہے اور شریعت پر استقامت کا عہد کرتا ہے، تو اس میں بڑی قوت آجاتی ہے۔ بیعت کا یہ طریقہ فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے یہاں اپنے امتیوں سے بیعت لینے کا عام دستور تھا۔ امام نسائی نے اپنی کتاب میں مختلف امور پر رسول اللہ ﷺ کے بیعت لینے کا ذکر فرمایا ہے۔ خود قرآن کریم میں ایمان و عمل صالح پر بیعت لینے کا ذکر موجود ہے، ارشاد ہے:

يٰايها النبى اذا جاءك المومنات يبايعنك على ان لا يشركن بالله شيئا ولا يسرقن ولا يزنين ولا يقتلن اولادهن ولا ياتين ببهتان يفترينه بين ايديهن وارجلهن ولا يعصينك فى معروف فبايعهن واستغفر لهن الله ان الله غفور رحيم

(سورہ ممتحنہ)

اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں اس غرض سے آئیں کہ تمہارے ہاتھ پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی۔ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی، کسی پر بہتان نہ باندھیں گی، اور معروف میں تمہاری نافرمانی نہ کریں گی، تو ان کو بیعت کرلو اور ان کیلئے اللہ سے استغفار کرو، بیشک اللہ غفور رحیم ہیں۔

یہ تو گناہوں سے اجتناب کے سلسلے میں بیعت ہے۔ بعض مواقع پر جہاد پر بیعت لینے کا ذکر ہے۔

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ ید اللہ فوق ایدیھم (سورہ فتح)

جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ در حقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ کے اوپر ہے۔

بیعت کی شکل کیا ہوتی ہے؟ اس کی وضاحت درج ذیل حدیث سے ہوتی ہے۔

عن عوف بن مالک الاشجعی قال کنا عندالنبی ﷺ تسعة او ثمانية او سبعة فقال الا تبایعون رسول الله ﷺ فبسطنا ایدینا و قلنا علی ما نبایعک یا رسول الله قال علی ان تعبدواالله و لا تشرکوا به و تصلوا الصلوات الخمس و تسمعوا و تطیعوا . (مسلم ابوداؤد ونسائی)

عوف بن مالک اشجعی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے۔ نو آدمی تھے، یا آٹھ یا سات آدمی آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اللہ کے رسول سے بیعت نہیں کرتے، ہم نے اپنے ہاتھ پھیلا دیئے، اور عرض کیا کہ کس امر پر بیعت کریں۔ یا رسول اللہ! آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور پانچوں نمازیں پڑھو اور احکام سنو اور مانو۔

حکیم الامت تھانویؒ اس پر تحریر فرماتے ہیں:

> ''حضرات صوفیاء کرام میں بیعت کا معمول ہے، جس کا حاصل التزام احکام (یعنی احکام ظاہری و باطنی پر استقامت) اور اہتمام کا معاہدہ ہے، جس کو ان کے عرف میں بیعت طریقت کہتے ہیں، بعض اہل ظاہر اس کو اس بنا پر بدعت کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ سے منقول نہیں ہے۔ صرف کافروں کو بیعت اسلام اور مسلمانوں کو بیعت جہاد کرنا معمول ہے، مگر اس حدیث میں صریح اثبات موجود ہے، کہ یہ مخاطبین چونکہ صحابہ ہیں، اس لئے یہ بیعت اسلام یقیناً نہیں ہے کہ تحصیل حاصل لازم آتا ہے اور مضمون بیعت سے ظاہر ہے کہ بیعت جہاد بھی نہیں ہے۔ بلکہ بدلالت الفاظ معلوم ہوتا ہے کہ التزام واہتمام اعمال کیلئے ہے۔ پس اس کے سنت ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ بعدہ بوجہ اشتباہ بیعت خلافت کے سلف نے صحبت پر اکتفا کیا، پھر خرقہ کی رسم بجائے بیعت کے جاری

> ہوئی، جب وہ رسم (بیعت) خلفاء میں نہ رہی تو صوفیہ نے اس مردہ سنت کو پھر جاری کیا۔ (شریعت وطریقت ص:۵۸)

ابتداء میں خلفاء وحکام عامۃ الناس سے بیعت لیا کرتے تھے، یہ بیعت حکومت سے وفاداری اور تسلیم وانقیاد کی تھی۔ اس دور میں اگر صوفیہ دست بدست بیعت طریقت لیتے تو صورۃً مشابہت کی وجہ سے خلفاء وحکام کو بدگمانی ہوتی، اور خطرات کا اندیشہ ہوتا۔ اس لئے حضرات مشائخ نے یہ طریقہ موقوف کردیا کیونکہ یہ مقصود نہیں ہے، صرف صحبت پر اکتفا کیا، پھر بعض حضرات نے بطور علامت کے بجائے بیعت کے خرقہ دینا تجویز کیا، جو اس بات کی نشانی ہوتی کہ اس شخص کو فلاں بزرگ کی خدمت وصحبت حاصل ہے۔ بعد میں بیعت کا دستور خلفاء نے ختم کردیا، تو مشائخ نے پھر وہی قدیم سنت تازہ کردی۔ (یہ مضمون **القول الجمیل** مؤلفہ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی میں بھی مفصل بیان کیا گیا ہے۔)

بیعت کی ضرورت:۔ یہ بات یقینی ہے کہ بیعت کی ضرورت اس درجہ عام نہیں ہے کہ ہر شخص کو اس کا پابند قرار دیا جائے، بہت سی سلیم طبیعتیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ خود بخود نیکی کی طرف مائل ہوتی ہیں، اور مختلف اسباب وعوامل سے ان کے اندر تقویٰ و دیانت کا رجحان متعین ہوجاتا ہے، ایسے لوگ اگر بیعت نہ ہوں تو مضائقہ نہیں، لیکن عام انسانی طبائع کو دیکھتے ہوئے اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے، امت کے حکیم حضرت تھانویؒ لکھتے ہیں کہ:

> ”نفس میں بعض خفیہ امراض ایسے ہوتے ہیں کہ وہ بدون تنبیہ شیخ محقق عارف کے سمجھ میں نہیں آتے، اور اگر سمجھ میں آ بھی جاتے ہیں تو ان کا علاج سمجھ میں نہیں آتا۔ اور جو معلوم ہوتا ہے تو نفس کی کشاکشی سے اس پر عمل مشکل ہوتا ہے۔ ان ضرورتوں سے پیر کامل تجویز کیا جاتا ہے کہ وہ ان باتوں کو سمجھ کر آگاہ کرتا ہے۔ ان کا علاج وتدبیر بتاتا ہے۔ کیونکہ خود اپنی حالت کا سمجھنا آسان نہیں ہوتا۔ اور شیخ کو بصیرت ہوتی ہے۔
>
> (شریعت وطریقت ص:۶۰ بحوالہ انفاس عیسیٰ وقصد السبیل، وعظ الباطن)

عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کمال بدون استاذ کے حاصل نہیں ہوتا۔ تو جب اس راہ طریقت میں آنے کی توفیق ہو تو استاذ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہئے جس کے فیض تعلیم و برکت صحبت سے مقصود حقیقی تک پہونچے۔ ؎

گر ہوائے ایں سفر داری دلا　　دامن رہبر بگیر و پس بیا
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق　　عمر بگذشت و نشد آگاہ عشق

اے دل! اگر اس سفر کی خواہش ہو تو رہبر کا دامن پکڑ کر پیچھے پیچھے آؤ، اس لئے کہ جو بھی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چلا۔ اس کی عمر گزر گئی اور وہ عشق سے آگاہ نہ ہو سکا۔

(شریعت و طریقت، ص: ۶۲ بحوالہ تعلیم الدین)

شیخ کامل: بیعت و صحبت کی اہمیت و ضرورت ثابت ہو جانے کے بعد ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سالک مطمئن ہو جائے، اور اس کی صحبت و تعلیم سے تقویٰ کی راہ طے کرے، ضرورت ہے کہ اس کے واسطے اعلیٰ درجہ کا دین دار و متقی اور صالح و مصلح تلاش کیا جائے کیونکہ صحبت و بیعت کی تاثیر بیان کی جا چکی ہے۔ حدیث شریف میں ہے:

عن ابی هريرة قال قال رسول الله ﷺ : المرء على دين خليله فلينظر احدكم من يخالل (ابو داؤد و ترمذی)	حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آدمی اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے، سو ذرا دیکھ بھال لینا چاہئے کہ کس کے ساتھ دوستی کرے۔

جب معمولی دوستی کے اندر یہ اثر ہوتا ہے تو شیخ اور استاذ سے تو اعلیٰ درجہ کی محبت ہوتی ہے، اس کا کیا کچھ اثر ہوگا۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ جس کے ساتھ جس قدر محبت و عقیدت ہوتی ہے، اسی اعتبار سے اس کے اعمال و اخلاق کا اثر جلد اور محکم طور پر سرایت کرتا ہے۔ اگر خدانخواستہ پیر کا حال بہتر نہیں ہوا تو اس کے حال کی خرابی مرید میں بھی آئے گی، اسلئے تلاش

مرشد میں بہت احتیاط کرنی چاہئے، ہر شخص اس لائق نہیں ہوتا کہ اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیا جائے۔

شیخ کامل کی پہچان:۔ مشائخ محققین نے شیخ کامل کی کچھ علامات ذکر کی ہیں جن کو دیکھ کر شیخ کامل کو پہچانا جا سکتا ہے۔ حضرت تھانویؒ نے ان علامات کو اس طرح تحریر کیا ہے:

(۱) علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو، خواہ تحصیل سے، خواہ صحبت علماء سے تاکہ فساد عقائد و اعمال سے محفوظ رہے۔ اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے، ورنہ مصداق ؎

اوخویشتن گم است کرا رہبری کند کا ہوگا

(۲) عقائد، اخلاق و اعمال میں شرع کا پابند ہو۔

(۳) تارک دنیا، راغب آخرت ہو، ظاہری و باطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو۔

(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو کہ یہ بھی شعبۂ دنیا ہے۔

(۵) بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو اور ان سے فیوض و برکات حاصل کئے ہوں۔

(۶) تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو، اور ان کی بری بات سنے یا دیکھے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو، یہ نہ ہو کہ ہر ایک کو اسکی مرضی پر چھوڑ دے۔

(۷) جو لوگ اس سے بیعت ہوں، ان میں سے اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔

(۸) اس زمانہ کے منصف علماء و مشائخ اسکو اچھا سمجھتے ہوں۔

(۹) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم و دیندار لوگ اسکی طرف زیادہ مائل ہوں۔

(۱۰) اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

(۱۱) خود بھی ذاکر و شاغل ہو۔ کیونکہ عمل یا عزم عمل کے بغیر تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔

(۱۲) مصلح ہو نرا صالح ہونا کافی نہیں۔ شیخ ہونے کے لئے دونوں کے جمع کی ضرورت

ہے کہ صالح بھی ہو اور مصلح بھی ہو، تاکہ جو مرض باطنی بیان کرے اس کو بہت توجہ سے سن کر اس کا علاج تجویز کرے، اور جو علاج تجویز کرے اس سے دم بدم نفع ہوتا چلا جائے، اور اس کے اتباع کی بدولت روز بروز حالت درست ہوتی جائے۔

جس شخص میں یہ علامات ہوں تو پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت صادر ہوتی ہے یا نہیں، یا یہ شخص صاحب تصرفات ہے یا نہیں، یا اس کو کشف ہوتا ہے یا نہیں، یا یہ جو دعا کرتا ہے قبول ہوتی ہے یا نہیں، کیونکہ یہ امور لوازم مشیخت یا ولایت سے نہیں ہے۔ اسی طرح یہ نہ دیکھے کہ اس کی توجہ سے لوگ مرغ بسمل کی طرح تڑپنے لگتے ہیں یا نہیں، کیونکہ یہ بھی لوازم بزرگی میں سے نہیں ہے۔ اصل میں یہ ایک نفسانی تصرف ہے جو مشق سے بڑھ جاتا ہے۔ یہ کام غیر متقی بلکہ غیر مسلم بھی کرسکتا ہے۔ اور اس سے چنداں نفع بھی نہیں ہے، کیونکہ اس کے اثر کو بقا نہیں ہوتا۔ صرف مرید غبی کیلئے جو ذکر سے اصلاً متاثر نہ ہوتا ہو چند روز تک شیخ کے اس عمل سے اس میں ایک گونہ تاثر و انفعال و قبول آثار ذکر کا پیدا ہو جاتا ہے، یہ نہیں کہ خواہ مخواہ لوٹ پوٹ ہی ہو جائے۔ (شریعت وطریقت ص:٦٤ بحوالہ تعلیم الدین)

کچھ ضروری اور مفید ھدایات :۔ اگر کوئی شخص ایک شیخ کی خدمت میں خوش اعتقادی کے ساتھ ایک معتد بہ مدت تک رہے، مگر اس کی صحبت میں کچھ تاثیر نہ پائے تو دوسری جگہ اپنا مقصود تلاش کرے۔ کیونکہ مقصود خدا تعالیٰ ہے کہ نہ کہ شیخ لیکن شیخ اول سے بد اعتقاد نہ ہو، ممکن ہے کہ وہ کامل و مکمل ہو مگر اس کا حصہ وہاں نہ تھا۔ اسی طرح اگر شیخ کا انتقال قبل حصول مقصود کے ہو جائے، یا ملاقات کی امید نہ ہو، جب بھی دوسری جگہ تلاش کرے۔ البتہ بلاضرورت محض ہوسناکی سے کئی کئی جگہ بیعت کرنا بہت برا ہے، اس سے بیعت کی برکت جاتی رہتی ہے، شیخ کا قلب مکدر ہو جاتا ہے، نسبت قطع ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے، اور ہر جائی مشہور ہو جاتا ہے۔

شیخ کو سب سے افضل سمجھنا :۔ مشہور ہے کہ اپنے پیر کو سب سے افضل سمجھے، ظاہراً اس میں اشکال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ وفوق

کل ذی علم علیم۔ ہر صاحب علم سے بڑھ کر دوسرا عالم ہے۔

اتنا سمجھے کہ میری تلاش سے زندہ لوگوں میں اس سے زیادہ نفع پہونچانے والا شخص مجھ کو نہیں مل سکتا۔ (شریعت وطریقت بحوالہ تعلیم الدین)

ریاضات ومجاہدات :۔ اہل تصوف کے یہاں تلاش مرشد کے بعد دوسرا اہم اور ضروری کام ریاضت ومجاہدۂ نفس ہے، اور یہ بات صرف اسی فن کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ آدمی کوئی بھی کمال حاصل کرنا چاہے اسے بہر حال محنت وکوشش، کلفت ومشقت اور جگر کاوی اور پتہ ماری سے چارہ نہیں۔ ایک کاشت کار سے لے کر ایک صاحب قرطاس وقلم تک جسے چاہیں دیکھ لیں۔ اگر کسی نے کوئی کمال حاصل کیا ہے تو استاذ کی رہنمائی کے بعد وہ مجاہدۂ ومحنت ہی کا ثمرہ ہوگا۔ راتوں کو جاگنا، دن کو تھکنا، جسم کو مشقتوں کا عادی بنانا، سردی گرمی کی تکالیف سہنا، کھانے پینے کے معمولات کا گڑبڑ ہونا، کبھی فاقہ کی نوبت آجانا، کون سی ایسی مشقت ہے جو کسی اہم مقصد کو حاصل کرنے کیلئے انسان نہیں برداشت کرتا۔ تحصیل علم کیلئے علم کے شیدائیوں نے جو مجاہدے کئے ہیں تاریخ کی داستانیں ان سے جگمگا رہی ہیں۔ یہ مجاہدہ کسی ایک علم کی خصوصیت نہیں ہے۔ تمام علوم کا یہی حال ہے۔ دنیاوی علوم میں اگر کوئی کسی کمال کا طالب ہے تو اسے بھی محنت ومشقت کا وہی وطیرہ اختیار کرنا ہوگا۔ جو دینی علوم کیلئے اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ عجیب بات ہے کہ ہر کام کیلئے مجاہدہ مسلم، ہر کمال کیلئے تحمل کلفت عین کمال، لیکن اگر صوفیہ قرب خداوندی کیلئے مجاہدہ کا نام لیں تو مورد طعن! یہ کہاں کا انصاف ہے۔ دوسرے علوم وفنون کیلئے اگر کوئی استاذ اپنے شاگردوں سے محنت ومشقت لیتا ہے، اس کے لئے اپنے تجربے سے کچھ اصول وقواعد اور طریقے متعین کرتا ہے۔ تو کسی صاحب کو یہ خیال نہیں گزرتا کہ یہ اصول وقواعد کتاب وسنت اور سلف صالح سے منقول ہیں یا نہیں؟ اس میں صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ حصول علم کیلئے یہ بات معین ہے یا نہیں، اگر معین ہے تو مضائقہ نہیں کہ وہ طریقہ مسلمانوں سے لیا گیا ہے، یا دوسری اقوام سے، لیکن مقاصد تصوف کو حاصل کرنے کیلئے اگر ضرورت کی بنا پر یا سہولت کے واسطے کچھ تجربہ کاروں نے کچھ مجاہدے یا

ریاضتیں تجویز کیں تو فوراً سوال قائم کردیا جاتا ہے کہ یہ طریقہ کتاب وسنت میں کہاں ہے، سلف صالح نے اس طریقہ پر کب عمل کیا ہے؟ یہ طریقہ تو جوگیوں سے لیا گیا ہے۔ یہود ونصاریٰ سے لیا گیا ہے؟ **و غیر ذلك من الخرافات** (۱)

کتاب وسنت کی ساری مشق کیلئے بس تصوف غریب ہی رہ گیا ہے۔ باقی کہیں کتاب وسنت کی ضرورت نہیں ہے، اور یہ وہ لوگ کرتے ہیں جن کو کتاب وسنت کے حروف و نقوش کے علاوہ کسی اور چیز سے مس نہیں جو حدیث **لم یبق من القرآن الا رسمه** (قرآن کی صرف تحریر باقی رہے گی) اور **لم یبق من الدین الا اسمه** (دین کا صرف نام باقی رہ جائے گا) کے مصداق ہیں، جن کی زندگیوں میں، ان کے مکان میں، ان کے لباس میں، ان کی اولاد میں، حتی کہ ان کے قلوب میں یہودیت اور نصرانیت بھری پڑی ہوئی ہے۔ اور کتاب وسنت کا دور تک پتہ نہیں چلتا۔

وسائل و مقاصد کا فرق :۔ یہ لوگ تصوف کو کتاب وسنت کے معیار پر پرکھتے وقت بھول جاتے ہیں ...... حالانکہ دوسری جگہوں پر یہ بات انہیں خوب یاد ہوتی ہے ...... کہ شریعت نے ان چیزوں کو جو بطور خود مقصود اور مطلوب ہیں متعین اور متشکل کردیا ہے، لیکن ان مقاصد کے حصول کیلئے ان کے ذرائع و وسائل میں وسعت کا راستہ اختیار کیا ہے، بعض مواقع پر تو شریعت نے مقصد کے ساتھ حصول مقصد کا بھی طریقہ متعین کردیا ہے۔ اس میں تو تغیر وتبدل ممکن نہیں، جیسے طہارت کیلئے پانی یا بوقت ضرورت مٹی کا استعمال، یا نماز کے اعلان کیلئے اذان پکارنا، کہ یہ ذرائع ہیں لیکن چونکہ حصول مقصود کیلئے شریعت نے انہیں ذرائع کو متعین کردیا ہے۔ اس لئے وضو کیلئے آدمی بجائے پانی کے کوئی اور سیال چیز استعمال کرے تو اس سے طہارت حاصل نہ ہوگی۔ اسی طرح نماز کی اطلاع عام کیلئے بجائے

---

(۱) بہت عرصہ سے شور مچایا جاتا ہے کہ تصوف ہندوؤں کے جوگ کا مثنیٰ ہے۔ اور صوفیوں نے جوگیوں سے اعمال واشغال حاصل کئے ہیں۔ پروپیگنڈہ خواہ کتنا ہی جھوٹا ہو، اس میں بڑی طاقت ہے۔ اچھے اچھے ذہن و دماغ اس شوروغوغا سے ماؤف اور بہتیرے کان اس چیخ وپکار سے بہرے ہوگئے ہیں، لیکن اس میں حقیقت کتنی ہے اس کا اندازہ کسی قدر خود اسی مضمون کے ذریعے ہوجائے گا۔ اللہ ہمارے ناقدین کو فہم سلیم دے۔

اذان کے اور کسی ذریعے سے کام لیا جائے تو وہ درست نہ ہوگا،

لیکن زیادہ تر مواقع میں شریعت نے حصول مقصود کا کوئی خاص طریقۂ کار مقرر نہیں کیا ہے۔ زمانہ اور ماحول کے لحاظ سے طریقۂ کار کے اخذ و اختیار کا معاملہ اصحاب معاملہ کے سپرد کر دیا ہے۔ البتہ جواز و عدم جواز کی حدود متعین کر دی ہیں کہ ان سے خروج نہ ہو، جواز کے دائرہ میں رہتے ہوئے مقاصد کے حصول کیلئے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ خواہ وہ خاص طریقہ عہد نبوت میں رہا ہو یا نہ رہا ہو، اس طریقے کو کتاب و سنت سے خارج نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جس طریقے کی اباحت کتاب و سنت سے ثابت ہوگئی۔ اس کو کیونکر کہا جا سکتا ہے کہ وہ قرآن و حدیث سے ثابت نہیں ہے، مثلاً تحصیل علم، مقاصد شرعیہ میں سے ایک عظیم مقصد ہے لیکن اس کیلئے شریعت نے کوئی خاص طریقہ منضبط نہیں کیا ہے۔ آدمی کوئی بھی جائز طریقہ اختیار کرے جس سے علم حاصل ہو جائے بس کافی ہے۔ اس میں اس اعتراض کی گنجائش نہیں ہے کہ تم نے فلاں خاص طریق سے علم حاصل نہیں کیا ہے۔ اس لئے تمہارا علم معتبر نہیں، بس شرط یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم سے منحرف نہ ہو۔

البتہ اس مسئلہ میں حدود کی رعایت ضروری ہے۔ یعنی اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اسے ذریعے اور سبب ہی کے درجے میں رکھا جائے، اس کو مقصود اور بالذات عبادت نہ بنا لیا جائے۔ ورنہ وہ بدعت قرار پائے گا۔ ذرائع میں بطور خود کوئی تقدس اور عبادت کا پہلو نہیں ہے۔ اگر ذرائع میں تقدس کا تصور ہے تو مقاصد کے اعتبار سے ہے، اگر کسی وقت ان سے مقصود کا حصول نہ ہو یا کسی وجہ سے ان میں ضرر کا پہلو غالب ہو جائے یا ان سے بہتر کوئی دوسرا طریقہ تحصیل مقصود کیلئے از روئے تجربہ حاصل ہو جائے، تو بے تامل اول کو چھوڑ کر دوسرے ذرائع اختیار کئے جائیں گے۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ تصوف کا مقصود، رضا خداوندی اور اخلاق عالیہ کا حصول، رذائل سے اجتناب، دل میں یاد الٰہی کا رسوخ اور عبادات میں ان کی روح یعنی خشوع وخضوع کا حصول ہے۔ ان مقاصد کے حصول کیلئے شریعت نے کچھ قواعد اور کچھ دستور اور

طریقے متعین کئے ہیں، ان کو نہ تو کبھی بدلا جا سکتا ہے۔ اور نہ انہیں ترک کیا جا سکتا ہے۔ یہ ذرائع قرب و رضا کے اعتبار سے تو ذرائع ہیں ورنہ وہ بذات خود مقصود اور عبادت ہیں۔ مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، تلاوت اور ذکر وغیرہ۔

لیکن ان مقاصد کے حصول اور ان کے مذکورہ بالا وسائل کو عمل میں لانے کی راہ میں بہت سے موانع پیش آتے ہیں، بہت سی رکاوٹیں اور اڑچنیں پڑتی ہیں، ان موانع کو ہٹانے اور ان رکاوٹوں کو دور کرنے کے لئے کچھ تدبیروں اور کچھ معالجات کی ضرورت پڑتی ہے۔ شریعت نے ان معالجات اور تدبیروں کو کسی خاص شکل میں متعین نہیں کیا ہے، انہیں تدبیروں اور انہیں معالجات کو اصطلاح صوفیہ میں ”مجاہدات و ریاضات“ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ مجاہدات نہ عبادت ہوتے اور نہ مقصود، اگر کسی شخص کو بغیر مجاہدہ و ریاضت کے مقصود حاصل ہو جائے تو اسے ان کی کچھ ضرورت نہیں۔ حضرات صحابہ کو حضور اکرم ﷺ کے فیض صحبت سے ان اصطلاحی مجاہدات کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ ان کیلئے نماز، روزہ، تلاوت قرآن اور ذکر الٰہی ہی کافی تھے۔ ان کے بعد بھی خود صحابہ کی برکت، دنیادارانہ ماحول کے مغلوب ہونے کی وجہ سے ان مجاہدات کی زیادہ ضرورت نہ تھی، مگر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، نفوس پر دنیاداری اور غفلت کا غلبہ ہوتا گیا، اب نماز، روزہ، تلاوت وغیرہ سب باقی ہیں، مگر تزکیہ نفس اور خشوع و ادب کا پتہ نہیں ہے۔ اس غفلت کو دور کرنے کیلئے ماہرین مناسب مجاہدے تجویز کرتے گئے، آج بھی اگر کسی کی استعداد عالی ہو یا مرشد قوی تاثیر رکھتا ہو تو زیادہ مجاہدہ کی ضرورت نہیں پڑتی۔

نفس و شیطان کی رخنہ اندازی :۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا تو فرشتوں کی طرح معصوم و بے خطا اور خواہشات و شہوات سے مبرا نہیں پیدا فرمایا۔ اور نہ شیاطین کی طرح سراپا طغیان و بغاوت بنا کر رکھا۔ بلکہ آگ پانی مٹی، ہوا کے امتزاج سے اس کا پتلہ اور ڈھانچہ بنایا۔ اور پھر اپنے خاص امر سے اس میں لطیف اور پاکیزہ روح ڈال دی۔ اس میں مذکورہ بالا چاروں عناصر کی خصوصیات بھی ہیں۔ اور روحانیت وملکوتیت کی

بھی استعداد ہے۔ پھر دونوں استعدادوں کی امداد کیلئے اللہ نے دو مخلوق برپا کیں۔ آگ، پانی مٹی اور ہوا کے آمیزہ سے شہوات وخواہشات سے بھرا نفس تیار ہوا جو ہر وقت لذت کوشی وعیش پرستی کی جانب دوڑتا رہتا ہے۔ اس کی امداد کیلئے ابلیس اور اس کی ذریت ہے۔ اور روح لطیف کی امداد کیلئے ملائکہ کا لشکر ہے۔ ان دونوں میں توازن برقرار رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان میں ایک اور قوت ودیعت فرمائی جس کا نام ''عقل'' ہے۔ اور عقل کی رہنمائی شریعت کے ذریعہ کی، عقل ان دونوں جذبات میں اعتدال وتوازن برقرار رکھتی ہے۔

اب غور کیجئے، اگر نفس کا میلان شہوت ومعاصی کی جانب ہے تو اس کو ہوا دینے والا شیطان موجود ہے۔ اور اگر روح کا انجذاب حق تعالیٰ کی بارگاہ قدس کی جانب ہے تو اس کی مدد کیلئے جنود ملائکہ حاضر ہیں۔ انسان اس کشمکش میں گرفتار ہوتا ہے تو عقل دونوں کے درمیان شریعت کی رہنمائی میں محاکمہ کرتی ہے۔ پھر تو وہ اسے نہ بالکل شیطان بن جانے دیتی ہے اور نہ انسانوں کی صف سے نکل کر فرشتہ بننے کی اجازت دیتی ہے۔ پس وہ انسان ہی رہ کر بارگاہ قدس میں ترقی کرتا رہتا ہے۔ تاہم عام انسانوں کے حق میں نفس وشیطان کا پلہ بھاری ہے، اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ انسان بچپن سے بلوغ تک ایسے عبوری دور میں ہوتا ہے۔ جبکہ عقل ناپختہ اور شعور نابالغ ہوتا ہے۔ اس دور میں روح بھی خوابیدہ اور نفس کے تابع ہوتی ہے، اس عبوری عہد میں نفس اپنی لذات وضروریات پر ٹوٹا رہتا ہے۔ اس عہد میں نفس کافی طاقتور ہو چکا ہوتا ہے، بلوغ کے وقت تک جبکہ اس کی عقل کامل ہوتی ہے۔ نفس کا غلبہ ہو چکا ہوتا ہے۔ اس عبوری مرحلہ سے گزرنے کے بعد وہ خدا کے احکام کا مخاطب ہوتا ہے۔ یہ احکام نفس کی عین ضد ہوتے ہیں کیونکہ نفس تو بالکل آزاد رہنا چاہتا ہے۔ اور احکام اسے پابند بناتے ہیں۔ پس وہ بغاوت کرتا ہے اور شیطان اس کی مدد کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ایمانیات کا تعلق غیبی حقائق سے ہے، اور اعمال صالحہ کی بنیادیں بھی غیبی امور پر ہیں۔ اس کے برخلاف نفس اور طبیعت کے تقاضے اور خواہشات کا تعلق اس دنیائے حاضر کے ساتھ ہے، اور آدمی کی نہاد عاجلانہ ہے۔ پس عالم غیب سے اس

کا تعلق ذرا مشکل سے قائم ہوتا ہے۔ اور اس دنیا کے ساتھ جلد رشتہ جڑ جاتا ہے۔ اسی لئے بیشتر نفوس اپنی لذات وخواہشات میں منہمک ہوتے ہیں۔

اب بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ بجبر اسے شریعت کی لگام پہنائی جائے اگر وہ گناہ پر دوڑے تو اس کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دی جائیں اس کے ملکات رذیلہ کو دور کیا جائے۔ خصائل حمیدہ کا اسے خوگر بنایا جائے۔ اور عبادت وطاعت کا ذوق اس کے اندر بیدار کیا جائے، یہی بنیاد ہے ریاضات اور مجاہدات کی۔

مجاہدے کی اقسام: مجاہدات کی حقیقت اجمالاً واضح کردینے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرات صوفیہ کے نزدیک جو ضروری مجاہدات ہیں جن کے اختیار کئے بغیر حصول مقصود ممکن نہیں، ان کا تذکرہ کسی قدر تفصیل سے کردیا جائے۔ اس سے اندازہ ہوجائے گا کہ صوفیہ کس قدر فطرت شناس اور روح ایمان کے کس درجہ عارف اور واقف کار ہیں۔ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہ فرماتے ہیں کہ:

> ''مجاہدے کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مجاہدہ جسمانی کہ نفس کو مشقت کا عادی بنایا جائے۔ مثلاً تکثیر نوافل سے نماز کا عادی کرنا اور روزے کی کثرت سے کھانے کی حرص وغیرہ کو کم کرنا۔
>
> اور ایک مجاہدہ مخالفت نفس ہے کہ جس وقت نفس معصیت کا تقاضا کرے اس وقت اس کے تقاضے کی مخالفت کرنا۔
>
> اصل مقصود دوسرا مجاہدہ ہے اور یہ واجب ہے۔ اور پہلا مجاہدہ بھی اسی کی تحصیل کیلئے کیا جاتا ہے۔ کہ جب نفس مشقت برداشت کرنے کا عادی ہوجائے گا تو اس کو اپنے جذبات کے ضبط کرنے کی بھی عادت ہوگی۔ لیکن اگر کسی کو بغیر مجاہدہ جسمانی کے نفس پر قدرت حاصل ہوجائے تو اس کو مجاہدہ جسمانیہ کی ضرورت نہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہیں۔ اسی واسطے صوفیہ نے مجاہدہ

جسمانیہ کا بھی اہتمام کیا ہے۔ (شریعت وطریقت ص: ۸۰ بحوالہ وعظ المجاہدہ)

مجاہدۂ جسمانی کے ارکان :۔ حضرات صوفیہ کے نزدیک جسمانی مجاہدہ کے چار بنیادی ارکان ہیں۔ اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کسی بھی فن میں اعلیٰ کمال حاصل کرنے کیلئے ان چاروں مشقتوں سے گزرنا ناگزیر ہے۔

اول **قلت طعام** : یعنی کم کھانا، کم کھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی اتنا کم کھائے کہ اس کی طبعی قوت گھٹ جائے، ۔ کم کھانے کا وہی مطلب ہے، جسے اطباء صحت جسمانی کیلئے ضروری قرار دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ جب تک خوب بھوک نہ لگے کھانا نہ کھایا جائے۔ اور جب تھوڑی بھوک باقی رہے جبھی ہاتھ کھینچ لیا جائے۔ یہ تدبیر جہاں صحت جسمانی کیلئے اکسیر ہے۔ صحت روحانی کیلئے بھی ناگزیر ہے۔ آدمی ہر وقت اناپ شناپ کھاتا رہے۔ یا ضرورت سے زائد پیٹ کو بھرتا رہے۔ تو اخلاط میں اعتدال باقی نہیں رہتا۔ جس سے اگر اس کی جسمانی صحت متاثر ہوتی ہے تو اسی کے ساتھ رطوبات فاسدہ کی کثرت کی وجہ سے قلب ودماغ تشویشات کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ جس سے دل کی یکسوئی باقی نہیں رہتی، جو کہ ایک ضروری چیز ہے۔

دوسرے **قلت منام** : کم سونا، اس سے بھی مراد یہ ہے کہ آدمی ضرورت سے زیادہ نہ سوئے۔ ضروری نیند جو چند گھنٹوں میں پوری ہو جاتی ہے اس سے زیادہ سونے سے بلغم بڑھتا ہے، سستی پیدا ہوتی ہے اور آدمی کاہل ہو کر رہ جاتا ہے۔

تیسرے **قلت کلام** : یعنی کم بولنا، اس مسئلہ میں تو شاید دنیا کے کسی عقل مند کو اختلاف نہ ہوگا کہ ضرورت سے زائد کلام کرنا ہر عملی مقصد کیلئے سخت مضر ہے۔ خاموشی سے بہتر وقت کو اور قوت کو بچانے والی کوئی چیز نہیں ہے۔

چوتھے قلت **اختلاط مع الانام** : یعنی لوگوں کے ساتھ کم سے کم تعلق رکھنا۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی زیادہ خلوت اختیار کرے، کسی کام کو تکمیل تک پہنچانے کیلئے خلوت جس قدر ضروری ہے اس سے کام کرنے والا ہر شخص واقف ہے۔

آدمی کا نفس ان چار چیزوں یعنی طعام، منام، کلام، اور اختلاط مع الانام کا حد درجہ حریص ہے۔ جب اس میں تقلیل کا ارادہ کیا جائے گا تو شدید مشقت برداشت کرنی ہوگی۔ مگر یہ چاروں مجاہدے ایسے ہی ضروری ہیں جیسے ذیابیطس کے مریض کو شکر سے پرہیز ضروری ہے۔

حکیم الامت لکھتے ہیں کہ:

> ''جو شخص ان چاروں کا عادی ہو جائے گا واقعی وہ اپنے نفس پر قابو یافتہ ہو جائے گا کہ تقاضائے معصیت کو ضبط کر سکے گا (تعلیم الدین)

مجاھدہ نفس :۔ مجاہدۂ نفس کا مطلب یہ ہے کہ جب نفس گناہ کا تقاضا کرے تو اس کی مخالفت کی جائے۔ اسے زبردستی معصیت سے روکا جائے۔ اس میں نفس کو شدید کلفت ہوتی ہے۔ یہ مجاہدہ فرض ہے۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے اور نفس کو ڈھیل دے دی جائے تو وہ معاصی کا ارتکاب کر کے ہر وقت غضب الٰہی کو دعوت دیتا رہے گا۔ لیکن عین گناہ کی خواہش کے وقت نفس کو قابو میں کرنا ایسا مشکل امر ہے کہ اس میں کامیابی کی امید بہت کم ہوتی ہے۔ البتہ اگر پہلے سے اس کی تدبیر کی جائے تو اول تو تقاضائے معصیت کم ہوگا اور اگر ہوگا تو اسکا مقابلہ آسان ہوگا، اس کی تدبیر کیا ہے۔ حضرت حکیم الامت کی زبانی سنئے فرماتے ہیں:

> ''یہ بات اس وقت حاصل ہوگی جب کہ نفس کی جائز خواہشوں کی بھی کسی حد تک مخالفت کی جائے۔ مثلاً کسی لذیذ چیز کو جی چاہا تو فوراً اس کی خواہش نہ پوری کی جائے بلکہ اس کے تقاضے کو روک دیا جائے۔ اور کبھی کبھی سخت تقاضے کے بعد اس کی جائز خواہش پوری کر دی جائے تا کہ نفس پریشان نہ ہو جائے۔ بلکہ اس کو کسی قدر خوش رکھا جائے۔ اور اس سے کام لیا جائے۔ اس لئے کہ مزدور خوش دل کار کند بیش، تو جب مباحات میں مخالف نفس کے عادی ہو گئے، اس وقت معاصی کے تقاضے کی مخالفت پر آسانی سے قادر ہو گے۔ اور جو شخص مباحات میں نفس کو بالکلیہ آزاد رکھتا ہے۔ وہ بعض اوقات تقاضائے معصیت کے وقت اسکو دبا نہیں سکتا۔ (تعلیم الدین، وعظ المجاہدہ۔ ایضاً)

مجاہدہ میں اعتدال :۔ اعتدال اور توسط تمام دینی اعمال میں ضروری ہے۔ یہ بات مجاہدے میں بھی قابل لحاظ ہے۔ مجاہدے سے مقصود نفس کو پریشان کرنا نہیں ہے۔ بلکہ اس کو مشقت کا عادی بنانا ہے، اور راحت و تنعم کی عادت سے باہر نکالنا ہے۔ اسی لئے حضرات مشائخ نے از خود کوئی مجاہدہ اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے۔ حضرت تھانوی کا ارشاد ہے کہ:

> ”پس مجاہدہ میں بھی اعتدال کی رعایت کرنا چاہئے۔ مگر اس اعتدال کو بھی اپنی رائے سے تجویز نہ کریں بلکہ کسی محقق سے درجۂ اعتدال اور طریق مجاہدہ معلوم کریں۔ (وعظ المجاہدہ۔ ایضا)

مجاہدہ درحقیقت معالجہ ہوتا ہے اور علاج ہمیشہ مریض کی طبیعت، اس کی قوت اور اس کے مرض کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور اس میں اس کی بھی رعایت ملحوظ ہوتی ہے کہ اس کو کس درجہ کی صحت و قوت مطلوب ہے۔ اس لئے جیسے ایک مریض کے علاج کو دوسرے مریض کے علاج پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح ایک شخص کے مجاہدے کو دوسرے کے مجاہدے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ اور نہ اس پر اعتراض کیا جاسکتا مثلاً ایک شخص کو زکام ہے اور دوسرے کو کینسر، زکام کے مریض کا علاج سستا اور اس کا پرہیز معمولی ہوگا، اس کی شفا بھی جلدی حاصل ہوتی ہے، اس کے برعکس کینسر کے مریض کا علاج گراں اور مشکل اور پرہیز سخت ہے۔ اور صحت بھی بہت دیر میں حاصل ہوتی ہے۔ دونوں ایک ہی طبیب کا علاج کرتے ہیں۔ لیکن دونوں کے علاج میں بہت فرق ہے۔

اسی طرح ایک عام آدمی ہے۔ اور ایک سپہ سالار افواج ہے۔ دونوں ایک مرض میں مبتلا ہیں۔ عام آدمی کو ہلکی دوا دی جاتی ہے اور عام غذا تجویز کی جاتی ہے، کہ اس کو شفا حاصل ہو اور بقدر ضرورت طاقت حاصل ہو جائے۔ لیکن سپہ سالار کو اعلیٰ قسم کی دوا تجویز کی جاتی ہے تا کہ جلد صحت حاصل ہو، اور عمدہ قسم کی مقوی غذائیں اور طاقت کی دوائیں بتائی جاتی ہیں کہ تا کہ پوری قوت عود کر آئے کیونکہ اس کا کام بڑا اور طالب مشقت ہے۔ پس اول کو

معمولی شفا مطلوب ہے اور دوسرے کو اعلیٰ درجہ کی شفا درکار ہے۔

ٹھیک یہی حال مجاہدات کا ہے، از خود اگر کوئی مجاہدہ اختیار کیا جائے گا تو نقصان کا اندیشہ ہے، اس کیلئے شیخ و راہبر کی ضرورت ہے، وہ موقع اور ضرورت کے مناسب مجاہدات تجویز کرے گا۔

بعض لوگ بزرگوں کے حالات کی کتابیں پڑھتے ہیں۔ ان میں ان کے بعض مشکل اور سخت مجاہدات منقول ہیں۔ ان سے انہیں وحشت ہوتی ہے۔ انہیں خیال کرنا چاہئے کہ ان حضرات سے بہت بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اس لئے ان سے مجاہدات بھی سخت کرائے گئے۔ ورنہ عام اور معمولی آدمیوں کے سلسلے میں ایسے مجاہدے منقول نہیں ہیں۔ یہ طبیب کی تجویز ہے اس پر غیر طبیب کو اعتراض کی گنجائش نہیں ہے۔

اور یہ بھی عجیب ستم ظریفی ہے کہ جن بزرگوں نے یہ مجاہدات کئے ہیں انہوں نے ان کے ذریعے بڑے بڑے کمالات حاصل کئے۔ انہیں ان پر کوئی اعتراض نہیں ہوا، لیکن آج کے بالشتیے، جن کو نہ ان مجاہدات کی ہوا لگی۔ اور نہ انہیں اپنے زور نفس کو ہاتھ لگانے کا کبھی حوصلہ ہوا، انہیں ان مجاہدات پر اعتراض سوجھ رہا ہے۔ دوستو! اگر تم سے نہیں ہوتا، نہ کرو، مگر اعتراض تو نہ کرو۔

یہی حال امراض کے اعتبار سے علاج کا ہے۔ کبھی مرض شدید ہوتا ہے تو علاج میں بظاہر سختی ہوتی ہے۔ ناواقف اسے سختی کہتا ہے۔ مگر واقف کار اسے عین شفقت تصور کرتا ہے۔ آخر ڈاکٹروں کے آپریشن اور چیر پھاڑ کو کون سختی کہتا ہے۔

مرض کی شدت اور علاج کی سختی:۔ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی کی سوانح حیات ''تذکرۃ الرشید'' میں حضرت کا ایک ملفوظ۔ منقول ہے۔ فرماتے ہیں:

> ''اخلاق سیئہ بہت سے ہیں مگر اکثر نے دس میں محصور کر دیا ہے۔ پھر ان دسوں کا خلاصہ تکبر کو بتایا ہے، اگر یہ دور ہو جائے تو باقی خود دور ہو جاتے ہیں۔ حضرت جنید

> بغدادی کے پاس کوئی آدمی بیس سال رہا اور ایک روز عرض کیا کہ حضرت اتنی مدت میں مجھے آپ سے کچھ حاصل نہیں ہوا وہ شخص اپنی قوم کا سردار اور برادری میں ممتاز تھا، آپ سمجھ گئے کہ اس کے دل میں بڑائی ہے فرمایا اچھا ایک کام کرو اخروٹوں کا ایک ٹوکرا بھر کر خانقاہ کے دروازے پر بیٹھ جاؤ اور پکارو کہ جو شخص مجھے ایک جوتا مارے گا، اس کو ایک اخروٹ دوں گا اور جو دو مارے گا تو دو دوں گا، اسی طرح زیادہ کرتے چلے جاؤ، جب یہ کام کر چکو اور اخروٹ کا ٹوکرا خالی ہو جائے تب میرے پاس آؤ، اس شخص نے کہا **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ**، حضرت یہ کام تو مجھ سے نہ ہو سکے گا۔ حضرت جنید نے فرمایا کہ یہ وہ مبارک کلمہ ہے کہ اس کو ستر برس کا کافر صدق دل سے ایک مرتبہ پڑھ لے تو واللہ مسلمان ہو جائے گا مگر تو اس وقت اس کے پڑھنے سے کافر طریقت ہو گیا۔ جا نکل جا، تجھے مجھ سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ (''تذکرۃ الرشید'' ج:۲ص:۱۳)

بزرگوں سے جو مجاہدات منقول ہیں، اگر ان میں ہمارے ذکر کردہ اس نکتے سے صرف نظر کر لیا جائے تو آدمی اعتراضات کی وادی میں جا گرے گا اور محروم ہوگا، نگاہوں کے اس قصور نے بڑی محرومیاں پیدا کی ہیں۔ اور بڑے فتنے اٹھائے ہیں۔ **اللھم انا نعوذ بک من الفتن ما ظھر منھا وما بطن۔**

☆☆☆☆☆

اذکار......اشغال......مراقبات

مبادی تصوف میں تیسری اہم چیز اذکار واشغال اور مراقبات ہیں۔

اذکار :۔ ذکر کی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک حیثیت سے تو یہ مقاصد میں داخل ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اذْکُرُوْا اللّٰہَ ذِکْراً کَثِیْراً۔ (سورہ احزاب)	اے ایمان والو! اللہ کا ذکر بکثرت کرو۔

دوسری جگہ فرمایا:

واذکر ربک فی نفسک تضرعا و خیفة و دون الجهر من القول بالغدو والآصال ولا تکن من الغافلین . (سوره اعراف)	اور اے شخص اپنے رب کی یاد کیا کر اپنے دل میں عاجزی کے ساتھ اور خوف کے ساتھ، اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ صبح وشام، اور غافلوں میں سے مت ہو۔ (بیان القرآن)

غفلت ذکر کی ضد ہے۔ غفلت حرام ہے اور ذکر فرض ہے، اور یہ خود مطلوب ہے۔

لیکن دوسری حیثیت سے مقصود ومطلوب کیلئے معاون اور ذریعہ بھی ہے۔ منجملہ مقاصد شرع کے محبت الٰہی کی تحصیل بھی ہے، جس قدر اللہ کا ذکر کیا جائے گا اسی قدر اللہ تعالیٰ سے محبت ہوگی۔ اور محبت کے بعد خدا کی اطاعت و بندگی پر دوام حاصل ہوگا، اور اس کے نتیجے میں خدا کا قرب میسر ہوگا۔ بزرگوں نے ذکر کو دونوں حیثیتوں سے اختیار کیا ہے۔ مقصود ہونے کے اعتبار سے یہ حضرات پوری زندگی کو ذکر سے سرشار کرنا چاہتے ہیں۔ جو ''ذکر کثیر'' کا اعلیٰ مصداق ہے۔ یہاں تک کہ ذکر کا رنگ ان پر اتنا چڑھ جاتا ہے کہ انہیں دیکھ کر اللہ یاد آنے لگتا ہے۔ جیسا کہ ایک حدیث میں نیک لوگوں کی علامت بیان کی گئی ہے کہ:

اذا راوا ذکر اللہ............جب ان پر نظر پڑے تو اللہ یاد آجائے۔

لیکن ذکر کا یہ رنگ آدمی پر چڑھے کیونکر؟ اس کیلئے بطور وسیلہ کے ذکر کو ہی استعمال کیا گیا۔ اور اس طرح کے ذکر کے مختلف طریقے تجربے کی رو سے تجویز کئے گئے ہیں، ان کی خاص خاص تعداد متعین کی گئی، ان کی وضع اور ہیئت مقرر کی گئی، جہر اور سر کی حدیں بنائی گئیں۔ اور ان سب کا ماحصل یہ ہے کہ ذکر بعجلت اور بسہولت دل میں راسخ ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ قرآن و حدیث میں ذکر کا حکم مطلق ہے۔ اس مطلق حکم کی تعمیل کیلئے اگر کوئی خاص طریقہ بشرطیکہ وہ جائز ہو۔ وضع کیا جائے اور اسے بطور وسیلہ کے عمل لایا جائے۔ اس طریقۂ خاص کو مقصود اور عبادت نہ قرار دیا جائے۔ تو اس میں اسی کو کلام ہو سکتا ہے۔ جو اصول شرع بلکہ اصول عقل سے بھی نابلد ہو۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ حضرات صوفیہ کبھی ذکر کا جہراً حکم دیتے ہیں، کبھی اس کیلئے بیٹھنے کی کوئی خاص ہیئت بتاتے ہیں، اور حکم دیتے ہیں کہ مثلاً **لا اللہ** پر سر اور گردن کو پیچھے لے جاؤ اور یہ خیال کرو کہ غیر اللہ کی محبت اور اس کا اثر دل سے خارج ہو رہا ہے۔ اور پھر **الا اللہ** کی ضرب دل پر لگاؤ کہ اللہ کا نور یا اللہ کی محبت دل میں پیوست ہو رہی ہے۔ یہ ضربیں متواتر اور مسلسل لگائی جاتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ دل سے غیر اللہ کی مقصودیت فنا ہو کر اللہ کی معبودیت مستحکم ہو جائے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کیلئے یہ طریق زیادہ موثر ثابت ہوا ہے۔ کبھی مشائخ ذکر قلبی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس کے بھی مختلف طریقے ہیں، مثلا یہ کہ خیال کرو کہ دل کی دھڑکنیں ناطق ہیں۔ اور اللہ اللہ کر رہی ہیں۔ یہ طریقے اس لئے اختیار کئے جاتے ہیں کہ ذکر کا رسوخ ہو جائے۔ کبھی پورے کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی مشق کراتے ہیں۔ کبھی الا اللہ کی ضرب لگاتے ہیں۔ کبھی صرف اللہ اللہ رٹاتے ہیں۔ یہ سب تمرینات ہیں۔ اور تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ ان کے مختلف اثرات قلب پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ سب قلب میں ذکر کے رسوخ کے اسباب و ذرائع ہیں۔ انہیں بدعت قرار دینا دینی اعتبار سے اپنی ذہنی افلاس کی خبر دینا ہے۔ ایک بچہ قرآن حفظ کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب تک وہ قرآن کے الفاظ اپنی زبان

سے نہیں رٹے گا کلمات قرآنی اس کی لوح دل پر نقش نہ ہوں گے، وہ کبھی پوری آیت دہراتا ہے، کبھی ایک ہی لفظ کا تکرار کرتا چلا جاتا ہے کیا اسکو بدعت کہا جائے گا۔

حضرات صوفیہ اللہ کے نام کو مختلف طریقوں سے رٹاتے ہیں۔ یہ طریقے مقصود نہیں ہیں، مقصود یہ ہے کہ وہ نام دل میں راسخ ہوجائے۔ اسی کے لئے ضربیں لگواتے ہیں۔ اسی کے لئے خلوت میں بٹھاتے ہیں۔ اس کیلئے چلوں کا حکم دیتے ہیں۔ خدا کے نام میں جو برکت اور حلاوت ہے، اس کے اثر سے رذائل فنا ہوتے ہیں۔ ایمان میں ترقی ہوتی ہے۔ دل نرم ہوتا ہے۔ ماسوی اللہ کی محبت دل سے زائل ہوجاتی ہے۔ غرض اس ایک نام کے رٹنے سے روح اسلام اور روح ایمان حاصل ہوتی ہے۔ اور یہی روح نہ حاصل ہوتو آدمی روح حیوانی رکھتے ہوئے مردہ ہے۔ حدیث میں ہے:

عن ابی موسیٰ قال قال رسول اللہ ﷺ مثل الذی یذکر اللہ والذی لا یذکر مثل الحی والمیت (رواہ البخاری ومسلم)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اس شخص کی مثال جو اللہ کو یاد کرتا ہے، اور جو نہیں یاد کرتا زندہ اور مردہ کی ہے۔

غرض یہ ہے کہ یہ تمرینات ہیں۔ جن سے مقصود یہ ہے کہ آدمی کے رگ وریشہ میں ذکر سرایت کرجائے اور کوئی لمحہ اس کا غفلت میں نہ گزرے۔ چنانچہ صدیوں کا تجربہ یہی ہے کہ جس نے ان طریقوں کے مطابق کسی مرشد کامل کی رہنمائی میں ذکر اللہ کی مشق کی، اس کا پورا وجود ذکر الٰہی بن گیا، اس کا مشاہدہ اس کثرت سے ہے کہ اس کی تکذیب، تواتر کی تکذیب ہے۔ اگر کسی کو تجربہ نہ ہوا ہوتو تجربہ کاروں کی بات کی تصدیق تو کرنی چاہیئے۔ ہاں اگر کوئی اس سے بہتر طریقہ ذکر الٰہی کے رسوخ کا لائے تو کیا مضائقہ ہے۔ ع

چشم ماروشن ودل ماشاد

لیکن مصیبت تو یہی ہے کہ دوستوں نے تصوف پر تو تیشہ چلا دیا۔ مگر اس کا کوئی بدل نہ پیش کرسکے، جو دولت ہاتھ میں تھی اسے ضائع کردیا، اور دوسری کوئی دولت عطا نہیں کی،

پس محروم تو کر دیا اور محرومی کا کوئی علاج نہیں کیا۔

کہتے ہیں کہ اعمال مسنونہ کافی ہیں۔ اس میں کیا شبہہ کہ وہ کافی ہیں۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اعمال مسنونہ کے جتنے مدعیان خام ہیں، ذرا سی ٹھیس میں ان کے تمام دعووں کی ہوا نکل جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ حضرات صحابہ کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت بابرکت اور نظر کیمیا اثر حاصل تھی۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور مشق و مجاہدہ کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کی نظر کی تاثیر ہی سے قلوب کی کایا پلٹ ہو جاتی تھی۔ لیکن اب جب کہ وہ دولت حاصل نہیں ہے۔ ذکر کے رسوخ اور دلوں کے نرمانے کیلئے کچھ نہ کچھ ضرورت پڑتی ہی ہے۔ آج بھی مشاہدہ ہے کہ اگر کوئی مرشد قوی النسبت اور زیادہ موثر ہوا تو اس کے مریدین و متوسلین کو زیادہ محنت و مجاہدہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جیسے کوئی بہت کامل اور اعلیٰ درجہ کا استاذ ہو تو طلبہ کم محنت کر کے بھی کامیاب ہو جاتے ہیں۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے دور میں یہ طریقے کہاں تھے؟ ہم عرض کریں گے کہ طرق اور ذرائع کے بارے میں یہ سوال بیجا ہے، کہ حضور کے زمانے میں کہاں تھے؟ ذرائع ضرورت کے وقت استعمال ہوتے ہیں۔ آپ کے زمانے میں آپ کی صحبت بابرکت کے ہوتے ہوئے ان طرق کی ضرورت نہ تھی۔ آپ کے بعد ضرورت ہوئی۔ جواز کی حدود میں رہ کر کوئی طریقہ بھی اختیار کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جہاد ایک شرعی فریضہ ہے، اس کی اقامت کیلئے ضرورت کے لحاظ سے جو چیز بھی جائز حدود میں ہوگی اسے اختیار کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اگر ذکر کے رسوخ کیلئے کوئی مناسب اور مؤثر طریقہ اختیار کیا جائے تو کیا حرج ہے۔

اشغال :۔ ''شغل'' بھی صوفیہ کا اصطلاحی لفظ ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ دل کی توجہ کو کسی ایک نقطہ پر مرکوز کرنے کے لئے کوئی عمل کیا جائے۔ تاکہ اس سے یکسوئی پیدا ہو، مثلاً لفظ اللہ موٹے حرفوں میں لکھ کر اس پر نگاہ جمائی جائے کہ پلک تک نہ جھپکے، اس سے قلب میں یکسوئی بھی حاصل ہوتی ہے اور اس پر کچھ ایسے اثرات بھی طاری ہوتے ہیں جن سے ذوق وشوق پیدا ہوتا ہے، پھر قلب تشویشات سے خالی ہو کر ہمہ وقت متوجہ بحق رہتا ہے۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ تحریر فرماتے ہیں:

''اشغال کا مقصود اصلی یہ ہے کہ قلب کا انتشار جو بوجہ تشویش افکار کے ہے دفع ہو کر جمعیت خاطر اور خیال کی یکسوئی حاصل ہو، تا کہ اس کے خوگر ہونے سے توجہ تام الی اللہ جو کہ مبتدی کو بوجہ غیب ہونے کے مدرک کے، اور مزاحم ہونے افکار مختلفہ اور حیات حاضرہ کے متعذر ہے (۱) سہل ہو جائے، اشغال مختلفہ اسی کے حیل (تدبیریں) اور طرق ہیں، نماز میں سُترہ کا حکم اس عمل کا ماخذ ہو سکتا ہے، کیونکہ بتصریح علماء اسرار مقصود سترہ سے بھی جمع خاطر اور ربط خیال و نفی انتشار ہے، جیسا کہ ابن ہمام میں شرح ہدایہ میں لکھا ہے، اور سترہ اس کی تدبیر ہے۔

(شریعت وطریقت ص:۲۷۳ بحوالہ التکشف)

دوسری جگہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

''غرض جتنے اشغال ہیں وہ جمع خاطر ہی کیلئے ہیں۔ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اور اس میں مشائخ نے یہاں تک وسعت کی ہے کہ جوگیوں تک سے بعض اشغال لئے ہیں۔ مثلاً حبس دم جو جوگیوں کا شغل ہے۔ مگر چونکہ ان کا مذہبی شعار نہیں ہے۔ اور خطرات دفع کرنے کیلئے نافع ہے۔ اس لئے اس کو اپنے ہاں لے لیا ہے، اور اس میں کچھ حرج نہیں ہے اور اس میں تشبہ ممنوع نہیں ہے، کیونکہ جو چیز کسی فرقہ کا نہ مذہبی شعار ہو اور نہ قومی، محض تدبیر کے درجے میں ہو، اس کو تدبیر ہی کی حیثیت سے کسی نفع کیلئے اختیار کرنے میں کوئی محذور شرعی نہیں ہے۔ چونکہ حبس دم بھی دفع خواطر کیلئے محض ایک طبعی تدبیر ہے۔ اس لئے اس کا استعمال جائز ہے۔ کیونکہ یہ اخذ تدبیر میں ہے نہ کہ کسی مذہبی یا قومی شعار میں، اور اس کے

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ خدا کی ذات چونکہ غیب ہے اور انسان مشاہدات کا خوگر ہے۔ پھر یہ کہ قلب انسانی پر ہر وقت مختلف قسم کے افکار کی یورش رہتی ہے۔ اس لئے سالک مبتدی کو اللہ کی طرف توجہ تام نہیں ہوتی، اس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے۔ اور بہت سے لوگ اس کے دفعیہ کے تدابیر پوچھتے رہتے ہیں۔ لیکن جب اس کی تدبیر بتائی جاتی ہے تو سطحی علم رکھنے والے اسے بدعت کہہ کہہ کر بدکتے ہیں اور محروم رہتے ہیں۔ **فویل لھم** ۔

> جواز کی دلیل خندق کا واقعہ ہے۔ یہ انتظام وتدبیر فارسیوں کا کوئی قومی یا مذہبی شعار نہ تھا۔ محض ایک تدبیر تھی۔ اس لئے حضور اکرم ﷺ نے اس کی اجازت دیدی تھی۔
>
> (شریعت وطریقت۔ ص:۲۷۳)

خوب یاد رکھئے کہ شاذ ونادر جو اشغال جوگیوں سے لئے گئے ہیں۔ وہ نہ تو بعینہٖ ان کے طریقے پر لئے گئے ہیں اور نہ ان پر مطلقاً عمل ہوتا۔ ان میں مشائخ نے تصرف کر کے ان کی ہیئت تبدیل کردی ہے، مثلاً حبس دم کے جو طریقے جوگیوں میں مروج ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک طریقہ ہمارے یہاں معمول بہ نہیں ہے، صرف معمولی درجے میں سانس روکنے کا عمل کیا جاتا ہے تاکہ کسی قدر گرمی پیدا ہوکر فاسد رطوبات جل جائیں اور اس سے یکسوئی پیدا ہو، پھر یہ کہ وہ بہت ناگزیر ضرورت کے وقت اختیار کئے جاتے ہیں۔ اور ہمارے مشائخ دیوبند نے تقریباً اسے بالکل ہی حذف کردیا ہے۔

اشغال کی ضرورت :۔ اشغال کی ضرورت کب ہوتی ہے، یہ بھی حضرت تھانوی کی زبانی سن لیجئے۔

> ”ذکر کے وقت اگر قلب میں جمعیت وخشوع معلوم ہو اور وہ روزانہ بڑھتی جائے اور وساوس وخطرات میں کمی ہونے لگے اور دل لگا کرے تب تو اشغال کی حاجت نہیں، اور ایک مدت تک ذکر کرنے سے قلب میں یکسوئی وخشوع نہ ہو تو مناسب ہے کہ کوئی شغل کرلیا کرے۔ (شریعت وطریقت ص:۲۷۴)

مراقبات :۔ مراقبہ بھی حضرات صوفیہ کی اصطلاحات میں سے ہے۔ اس اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا یا اس سے متعلق کسی اور مضمون کا اکثر احوال میں یا کسی خاص محدود وقت میں دل سے پورے تدبر اور کامل غور وفکر کے ساتھ خیال جمانا۔ اور اس کا تصور بطور مواظبت کے رکھنا تاکہ اس تصور کے غلبہ سے اس کے مقتضا پر عمل ہونا آسان ہوجائے۔ یہی عمل مراقبہ کہلاتا ہے۔ مراقبہ کا فائدہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کا ناقص اور ناتمام تصور جو کبھی ذہن میں حاضر ہوتا ہے، اور بیشتر اوقات غائب رہتا ہے۔ یہ تصور راسخ

ہو جائے۔ اسی رسوخ میں مشائخ عوام سے ممتاز ہوتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

الاحسان ان تعبد الله کانک تراه فان لم تکن تراه فانه یراک	احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے

اور فرمایا:

احفظ الله تجده تجاهک	اللہ تعالیٰ کا دھیان رکھو اسے اپنے سامنے پاؤ گے

دونوں حدیثوں کا خلاصہ یہ ہے کہ بندے کو چاہئے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار اس طرح رکھے گویا اسے اپنے سامنے پا رہا ہے، اسے دیکھ رہا ہے۔ اور ایسا اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کا گہرا تصور آدمی کو حاصل ہو۔ اس کے بغیر استحضار ناممکن ہے۔ اسی گہرے تصور اور کامل توجہ کو حاصل کرنے کیلئے مشائخ مختلف مراقبات تجویز کرتے ہیں، کبھی کسی خاص صفت کا مراقبہ تلقین کرتے ہیں، کبھی محض ذات کا مراقبہ، حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا استحضار تام حاصل ہو جائے۔ (ماخوذ از شریعت وطریقت)

مشارطہ اور محاسبہ :۔ مراقبہ سے تعلق رکھنے والی دو چیزیں اور ہیں۔ ایک مراقبہ سے پہلے اور ایک مراقبہ کے بعد، مراقبہ سے پہلے مشارطہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ روزانہ صبح اٹھ کر تھوڑی دیر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے نفس کو خوب فہمائش کرے کہ دیکھو فلاں فلاں کام کرنا، اور فلاں فلاں نہ کرنا، اس کے بعد دن بھر صبح کو دی ہوئی ہدایات کی نگرانی کرتے رہنا اور جب دن ختم ہو۔ پھر سوتے وقت صبح سے شام تک جو اعمال کئے ہیں ان کا تفصیلی جائزہ لے، جو کام نیک ہوئے ہوں ان پر شکر الٰہی بجا لائے، اور جو برے کام صادر ہوئے ہوں، ان پر نفس کو ملامت اور زجر و توبیخ کرے۔ اگر صرف زجر و توبیخ کافی نہ ہو تو کچھ سزا تجویز کرے، اس کو عمل میں لائے اسی طریقۂ کار کو محاسبہ کہتے ہیں۔ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ۔ چاہئے کہ ہر شخص غور کرلے کہ کل کیلئے کیا ہے؟

مراقبات بہت سے ہیں۔ ان سب کا مقصود ایک ہے کہ حق تعالیٰ کی حضوری، ان کی محبت، ان کی یاد اور ان پر اعتماد کلی حاصل ہوجائے۔ اس استحضار سے بندے کو حق تعالیٰ سے حیا کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ جس کی برکت سے معاصی سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔ اور طاعات کی رغبت پیدا ہوتی ہے۔

یہ مبادی تصوف پر مجمل گفتگو کی گئی ہے۔ تفصیل کیلئے تو دفتر درکار ہے۔ لیکن اس سے اندازہ تو ہوہی گیا کہ مقاصد تصوف کے حصول کیلئے جو تمہیدات ومقدمات تجویز کئے گئے ہیں اور ان کی افادیت ونافعیت پر صدیوں کا تجربہ شاہد ہے، ان کو بدعات کے ذیل میں شمار کرنا حقیقت ناشناسی کی دلیل ہے۔ البتہ ناقص متصوفین جب ان مبادی کو مقصود کے درجے پر رکھنا شروع کردیں تو یقیناً ان پر نکیر کی جائے گی۔ یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہئے کہ ان مبادی میں کوئی چیز مقصود نہیں ہے۔ اگر ان کے علاوہ کسی اور چیز سے مقصود حاصل ہوجائے تو ان مبادی کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اور یہ نہیں کہا جاسکتا کہ ان مبادی کو عمل میں لائے بغیر مقصود کا حصول معتبر نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے یہاں ایک مقولہ بہت رائج ہے۔ **طرق الوصول الی الله بعدد انفاس الخلائق** ۔ خدا تک پہونچنے کی راہیں مخلوقات کی سانس کے بقدر ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے، ایمان حاصل ہونے اور فرائض وواجبات کے بعد خدا کے قرب ورضا کو حاصل کرنے کا کوئی ایک ہی طریقہ متعین نہیں ہے۔ بے شمار ذرائع ووسائل کو کام میں لاکر خدا کا قرب حاصل کیا جاسکتا ہے۔ خواہ وہ صوفیہ کا متعارف طریقہ ہو یا کوئی دوسرا طریقہ۔

تاہم یہ بھی مسلم ہے کہ حضرات صوفیہ کے متعارف طریقوں سے جس درجہ جذب وحضوری اور یقین وتوکل کا حصول ہوتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہے کہ دوسرے ذرائع اتنے مفید اور تام نہیں ہیں۔

توابع وثمرات

آدمی کسی فن میں کوشش اور محنت کرتا ہے۔ اس کے اندر کمال پیدا کرنے کی لگن میں رہتا ہے۔ اور اسے ہمہ وقت برتتا رہتا ہے۔ تو تجربہ ہے کہ اس کے اسرار ورموز اس پر کھلنے لگتے ہیں۔ وہ بڑے عجیب عجیب تجربات سے گذرتا ہے۔ جو باتیں پہلے اس کے وہم و گمان میں نہیں آتی تھیں۔ وہ اس کے تجربات ومشاہدات کے ذیل مین آکر بدیہیات و ضروریات میں شامل ہوجاتی ہیں۔ یہ تجربہ کسی ایک فن کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ معمولی کاشتکاری و دست کاری سے لیکر اعلیٰ درجے کے علمی مشاغل تک کے ماہرین ان تجربات سے گزرتے ہیں۔

اسی طرح انسان جب اپنے باطن کی اصلاح اور نفس کے تزکیہ کی راہ پر قدم رکھتا ہے۔ وہ اپنی پوری قوت اور ہمت کے ساتھ اپنے قلب کو ذکر کے نور سے روشن کرنا چاہتا ہے، اور شب وروز اسی دھن میں لگا رہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو اس کے وجود کو کچھ مخصوص نوازشوں کے ساتھ سرفراز کرتے ہیں۔ اس پر غیبی حقائق کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ اگر اس کی دماغی استعداد عالی ہوتی ہے، تو قرآن وسنت کے اسرار وغوامض اس پر کھلنے لگتے ہیں، اس کی طبیعت کا رنگ بدل جاتا ہے۔ ایک عام آدمی بھی وہی قرآن وحدیث پڑھتا ہے، اور یہ شخص بھی وہی قرآن وحدیث پڑھتا ہے، لیکن اول کے قلب پر کوئی خاص اثر مرتب نہیں ہوتا، اور اس کے ایمان میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ دل شوق یا خوف سے معمور ہوجاتا ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے اُبل پڑتی ہیں، ہر ہر آیت پر خدا سے نیا عہد وپیمان باندھتا ہے۔ غرضیکہ اسے کچھ ایسی خاص باتیں حاصل ہوتی ہیں جن کی دوسروں کو خبر نہیں ہوتی۔

ایک بزرگ کی خانقاہ میں ایک عالم تشریف لے گئے۔ رات کے سناٹے میں دیکھا کہ ذاکرین کی جماعت بیدار ہوئی، اور تہجد کی رکعتیں پڑھ کر لوگ اپنے اپنے اذکار میں لگ گئے، پھر ان عالم کی آنکھوں نے دیکھا کہ کوئی رو رہا ہے۔ کسی کی چیخ نکل رہی ہے۔ کوئی چپکے چپکے آنسو بہا رہا ہے۔ کوئی ساکت وصامت گردن جھکائے بیٹھا ہے، کوئی مناجات

کر کے سو طرح اپنے رب کی خوشامد کر رہا ہے۔ انہوں نے صبح کو شیخ خانقاہ سے عرض کیا کہ یہی کلمہ میں بھی پڑھتا تھا۔ اور مجھ پر کوئی اثر نہیں ہوتا تھا، اور یہی کلمہ دوسرے لوگ پڑھ پڑھ کر بے حال ہوئے جا رہے تھے۔ اس میں کیا راز ہے۔ شیخ نے اول تو ٹالا کہ یہ لوگ دل کے ضعیف ہیں، زود حس ہیں، وغیرہ۔ لیکن پھر ان کی درخواست پر انہیں بھی ذکر تلقین کیا، اس تلقین کے بعد جب وہ ذکر کیلئے بیٹھے تو شدت گریہ کی وجہ سے کلمہ ادا نہیں ہوتا تھا۔ بعد میں آ کر عرض کیا کہ میں سمجھ تو نہیں سکا کہ کیا بات ہے، مگر دل ہے کہ امنڈا چلا آتا تھا۔

ان کیفیات کو حضرات صوفیہ اپنی خاص اصطلاح میں ''احوال'' سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ احوال محض فضل خداوندی سے نصیب ہوتے ہیں۔ ان کے ملنے نہ ملنے میں بندے کے اختیار کو دخل نہیں ہوتا۔ تاہم عموماً تجربہ یہی ہے کہ بندہ جب اپنے کو یاد الٰہی میں کھپاتا ہے تو اس کی استعداد و قوت کے بقدر ان مواہب سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

احوال رفیعہ :۔ ہندوستان کے مایۂ ناز اور مشہور عالم و محدث حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی قدس سرہ نے اپنی کتاب **القول الجمیل** میں تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''جن لوگوں کو سکینہ پر دوام و استقامت نصیب ہوتی ہے۔ انہیں یکے بعد دیگرے بلند احوال نصیب ہوتے رہتے ہیں۔ سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت سمجھے اور یہ جان لے کہ یہ حالات اس بات کی علامت ہیں کہ اس کی طاعت حق تعالیٰ کے نزدیک مقبول ہے۔ اور یہ کہ اس کا باطن نفس اور دل کی گہرائی اطاعت الٰہی سے متاثر ہے۔ (حضرت شاہ صاحب کا یہ مضمون مصلح الامت حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحبؒ کی کتاب ''تصوف اور نسبت صوفیہ'' سے ماخوذ ہے۔ اصل کتاب القول الجمیل سے بھی اس کی مراجعت کر لی گئی ہے)

شاہ ولی اللہ ایک ایسے عالم و محدث ہیں جن پر ہندوستان کے بیشتر علمی حلقوں کا اعتماد ہے، ان کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ صاحب سکینہ کو بہت سے بلند احوال حاصل ہوتے ہیں۔ ان احوال کی قدرے تفصیل آگے آ رہی ہے، لیکن ہمارے زمانے میں دینی

اصطلاحات اور علوم دینی سے اس قدر بُعد ہوگیا ہے کہ اکثر اصحاب کیلئے لفظ ''سکینہ'' نامانوس ہوگا۔ اور بعض سطح بینوں اور سرسری مطالعہ والوں نے اس باب میں بڑا مغالطہ پیدا کر رکھا ہے کہ جہاں کوئی لفظ انکی عقل وفہم سے بالاتر اہل علم کی کتابوں میں آیا، تو بجائے اس کے کہ وہ اپنے قصور علم اور کوتاہی نظر کا اعتراف کریں۔ ان الفاظ کو ہی بے معنی اور بے اثر بنانے کی کوشش کرنے لگتے ہیں، اس طرح آہستہ آہستہ وہ تمام الفاظ واصطلاحات جو آج سے ایک صدی پیشتر نہ صرف یہ کہ مانوس تھے، بلکہ ناخواندہ حتی کہ غیر مسلموں تک میں متعارف تھے۔ آج پڑھے لکھے لوگ بھی ان سے اجنبیت محسوس کرتے ہیں۔ یہاں ہم چاہتے ہیں کہ احوال کی قدرے تفصیل بیان کرنے سے پہلے لفظ سکینہ کی تشریح کردیں، اور یہ تشریح بھی ہم حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ ہی سے مستعار لیں گے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

> ''تمام مشائخ کے طریقوں کا مقصد ومنتہیٰ ایک خاص نفسی کیفیت کا حاصل کرنا ہے۔ جس کا نام ان کی اصطلاح میں ''نسبت'' ہے۔ کیونکہ یہ ہیئت نفسی درحقیقت انسان کا حق اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط وارتباط ہے۔ اسی کا نام سکینہ بھی ہے۔ اور اس کو نور بھی کہتے ہیں، اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ فطرت انسانی میں یعنی اس کے نفس ناطقہ میں ایک ایسی کیفیت سرایت کرجاتی ہے جس کی وجہ سے اسے ملائکہ کے ساتھ مناسبت پیدا ہوجاتی ہے اور عالم بالا کے مشاہدہ کا ملکہ پیدا ہوجاتا ہے۔

اس عبارت کی تشریح میں مشہور بزرگ عالم اور محقق شیخ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب نوراللہ مرقدہ لکھتے ہیں:

> ''تفصیل اس کی یہ ہے کہ انسان جب طاعات، طہارات اور اذکار وغیرہ پر مداومت کرتا ہے تو اس کی وجہ سے اس کے نفس میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ جس کی وجہ سے اس کو ہر کام اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے کرنے کا ایک ملکۂ راسخہ پیدا ہوجاتا ہے۔ اسی ملکہ کا نام نسبت، سکینہ اور نور ہے۔ اور حصول نسبت کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بندہ کو ادھر توجہ تام ہوگئی، اور اس کو حق تعالیٰ سے تعلق ہوگیا ورنہ حق تعالیٰ کو تو بندہ سے نسبت

ہوتی ہی ہے جیسا کہ مولانا روم فرماتے ہیں:

اتصالے بے تکیف بے قیاس   ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی حق تعالیٰ کو مخلوق کے ساتھ ایک ایسا اتصال یعنی نسبت حاصل ہے جس کی نہ تو کیفیت کا بیان ہوسکتا ہے اور نہ کسی چیز پر اسکو قیاس کیا جا سکتا۔

(تصوف اور نسبت صوفیہ بحوالہ مجموعۂ تالیفات ج:۴ص:۱۴۳)

چند احوال رفیعه :۔ مشائخ کو حصول نسبت کے بعد جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے بہت سے بلند احوال حاصل ہوتے ہیں جن کی عوام الناس کو تو ہوا بھی نہیں لگتی اور وہ علماء جو صرف علم کے ظاہر پر اکتفا کئے رہتے ہیں اور قلب و باطن کی طرف توجہ نہیں کرتے وہ بھی ان سے اکثر محروم رہتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے ان احوال رفیعہ میں سے چند ایک کو شمار کرایا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ ان میں سے بعض احوال اپنے تعارف کیلئے مبسوط مقالہ چاہتے ہیں، کیونکہ ہمارے دور میں یہ چیزیں نامانوس اور اجنبی بن چکی ہیں۔ نہ صرف اجنبی بلکہ ستم ظریفوں نے اپنی کوتاہی عقل کی وجہ سے انہیں اعتراضات کا ہدف بھی بنا رکھا ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کی حقیقت واضح کردی جائے، **لیھلک من ھلک عن بینة ویحییٰ من حی عن بینة** لیکن اس مقالہ میں زیادہ بسط کی گنجائش نہیں، یونہی یہ مقالہ طویل ہوگیا ہے تاہم اختصار کے ساتھ ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(۱) سالک کو حصول نسبت کے بعد ایک عظیم القدر حال یہ نصیب ہوتا ہے کہ وہ نفس کی شدید کشاکش سے نجات پاکر اللہ تعالیٰ کی اطاعت کو دوسری تمام چیزوں پر ترجیح دیتا ہے، اس کا ایک ہی مطمح نظر رہتا ہے کہ حق تعالیٰ راضی ہوجائیں اس کے لئے وہ سو طرح کے جتن کرتا ہے۔

(۲) اسی طرح اس کو ایک بڑی دولت یہ حاصل ہوتی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کے خوف اور اس کی خشیت کا اتنا غلبہ ہوتا ہے کہ اس کے آثار قلب سے چھلک کر بدن اور دوسرے اعضا پر ظاہر ہونے لگتے ہیں۔

(۳) صاحب نسبت کو حق تعالیٰ کی جانب سے رویا صالحہ (اچھے خواب) کی نعمت میسر آتی ہے جس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ نیک آدمی کا رویا نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے، نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ میرے بعد نبوت کے حصوں میں سے صرف مبشرات رہ جائیں گے، صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اچھا خواب جسے کوئی نیک آدمی دیکھے، یا اس کے واسطے کسی دوسرے نیک اور صالح شخص کو دکھایا جاوے، چنانچہ حق تعالیٰ کے قول **لھم البشریٰ فی الحیوٰۃ الدنیا** میں بشریٰ کی تفسیر رویا صالحہ سے کی گئی ہے۔

(۴) اسی طرح صاحب سکینہ کو اس دنیا میں فراست صحیحہ کی دولت حاصل ہوتی ہے یعنی دل میں ایسی بات کا آجانا جو حقیقت کے مطابق ہو، اسی لئے حدیث میں آتا ہے کہ **اتقوا فراسة المومن فإنه ینظر بنور الله** یعنی مومن کی فراست سے بچو اس لئے کہ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔

(۵) صاحب نسبت کو ایک بڑا انعام حق تعالیٰ کی بارگاہ سے یہ ملتا ہے کہ اس کی اکثر دعائیں قبول ہوتی ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بندے کو ایسی نسبت اور ایسا تعلق قائم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنی جس ضرورت کے لئے جہد وہمت اور قلب کی پوری توجہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے عطا فرماتے ہیں۔

(۶) اسی طرح صاحب سکینہ کو ایک بلند حال یہ ملتا ہے اگر اللہ پر توکل کر کے کسی بات کی قسم کھالے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم پوری کر دیتے ہیں، جیسا کہ حدیث شریف میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

رب أشعث ذی طمرین لا یعبأ به أحد لو أقسم علی الله لأبره

یعنی بہت سے غبار آلود، پراگندہ بال، پھٹے پرانے کپڑے والے، جن کو کوئی خاطر میں نہیں لاتا لیکن اللہ کے نزدیک ایسا مرتبہ رکھتے ہیں کہ اگر اللہ کے بھروسہ پر قسم کھا بیٹھیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا کر دیں۔

مطلب یہ ہے کہ ظاہر حال تو ایسا ردی کہ لوگ اپنے پاس بٹھانا گوارا نہ کریں، مگر خدا کے نزدیک ایسا درجہ کہ اگر کچھ زبان سے نکال دیں، تو اللہ تعالیٰ ان کی لاج رکھنے کے لئے وہی کر دیتے ہیں۔

صاحب سکینہ کے ان احوال کا ذکر کر کے شاہ صاحب پھر پہلی بات کا اعادہ کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ:

> ’’خلاصۂ کلام یہ ہے کہ ایسے احوالِ رفیعہ جو مذکور ہوئے، اور انھیں کے مانند دوسرے حالات عالیہ، یہ سب اس بات کا پتہ دیتے ہیں کہ اس شخص کا ایمان صحیح ہے، اور اس کی طاعات عنداللہ مقبول ہیں، نورِ ایمان اس کے باطن میں سرایت کئے ہوئے ہے، لہٰذا سالک کو چاہئے کہ ان احوال کو غنیمت سمجھے، کیونکہ یہ سب اس کے ایمان کی دلیل ہے۔‘‘ (مجموعۂ تالیفات مصلح الامۃ ج:۴، ص:......)

یہ چند خدائی انعامات ہیں، جو حق تعالیٰ کی جانب سے صاحب نسبت کو ملتے ہیں، اتنے ہی پر بس نہیں ہے، ان کے علاوہ اور بھی گنجہائے گرانمایہ ہیں، جن سے سالکین نوازے جاتے ہیں۔

الہام : مثلاً ایک بڑی نعمت جو اصحاب نسبت کو ملتی ہے وہ الہام ہے، الہام کی حقیقت یہ ہے کہ بغیر نظر و استدلال کے اللہ تعالیٰ کوئی حقیقت بندے کے قلب میں القاء فرما دیں، یا کسی غیبی مخلوق کے ذریعہ اطلاع بخش دیں جیسا کہ قرآن کریم میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدۂ محترمہ کے لئے ارشاد ہے:

وَاَوْحَيْنَا اِلٰى اُمِّ مُوْسٰى اَنْ اَرْضِعِيْهِ (سورہ قصص)	ہم نے موسیٰ کی ماں کی جانب وحی کی کہ دودھ پلاتی رہو۔

یہ وحی باتفاق مفسرین الہام ہے، اسی طرح حضرت مریم کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے:

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلَائِكَةُ يٰمَرْيَمُ	جب فرشتوں نے کہا اے مریم

فرشتے کا حضرت مریم سے خطاب فرمانا الہام کی قبیل سے ہے، یہ دولت اللہ تعالیٰ صاحب نسبت بندوں کو عطا فرماتے ہیں۔

موطا امام مالک میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:

أنا عمر ولم أحرص علىٰ أمركم	میں عمر ہوں اور تم پر حاکم بننے کی مجھے خواہش نہ تھی،
لكن المتوفىٰ أوصىٰ إلى بذٰلك	لیکن متوفی (یعنی ابوبکر) نے مجھے اس کی وصیت کی
و الله ألهمه ذٰلك۔	اور اللہ نے ان کے قلب میں اس کا الہام فرمایا۔

کشف: الہام اور فراست سے مشابہ ایک بڑی نعمت اہل نسبت کو میسر آتی ہے وہ کشف ہے، کشف کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی کے قلب میں عالم غیب کی اشیاء منکشف ہوجائیں اور وہ انھیں اس طرح دیکھ لے جس طرح ظاہری آنکھوں سے دنیا کی چیزیں دیکھتا ہے، بخاری و مسلم میں حضرت انس بن نضر کا قول مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا کہ إني لاجد ريحها من دون احد میں جبل احد کے پیچھے جنت کی خوشبو پاتا ہوں۔ اس روایت کی شرح میں امام نوویؒ فرماتے ہیں:

محمول علىٰ ظاهره وان الله	یہ روایت اپنے ظاہری معنی پر محمول ہے
اوجد ريحها من موضع	یعنی اللہ تعالیٰ نے اس کی خوشبو میدان
المعركة۔	جنگ میں محسوس کرادی۔

غزوۂ احد ہی کے متعلق حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، وہ فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ احد میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کے دائیں بائیں دو شخص سفید لباس پہنے ہوئے ......، بہت سخت لڑائی لڑ رہے تھے میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا اور نہ بعد میں دیکھا یعنی جبرئیل و میکائیل علیہما السلام۔ (بخاری و مسلم)

دنیا میں جنت کی خوشبو پالینا اور فرشتوں کو جو غیبی مخلوق ہیں دیکھ لینا، ان کا تعلق کشف سے ہے۔

کشف کی قسمیں: کشف کی دو قسمیں ہیں، کشفِ کونی و کشفِ الٰہی،

کشف کونی کا مطلب یہ ہے کہ زمان ومکان کی دوری صاحب کشف کے لئے حجاب نہ رہے اور کسی چیز کا حال معلوم ہو جائے، اور کشف الٰہی یہ ہے کہ علوم واسرار اور حقائق ومعارف خواہ سلوک کے متعلق ہوں یا حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق اس کے قلب پر وارد ہوں، یا عالم مثال میں یہ چیزیں متمثل ہو کر مکشوف ہوں، اور وارداتِ غریبہ ومواجید مثل ذوق وشوق، محبت واُنس وہیبت وانکشاف اسرار احکام وحسن معاملہ **فیما بینہ وبین اللہ تعالیٰ** وغیرہ فائز ہوں، جن کی لذت کے سامنے ہفت اقلیم کی سلطنت گرد ہے۔

علوم کشفیہ کا درجہ: کشف والہام سے علم ظنی حاصل ہوتا ہے، اگر شرعی قواعد کے مطابق ہے تو قابل عمل ہے ورنہ واجب الترک ہوگا، حقائق ومعارف بھی وہی مقبول ہیں جن کو شریعت رد نہ کرے، رسالہ قشیریہ میں ابو سلیمان دارانی کا قول منقول ہے کہ اکثر میرے دل میں کوئی نکتہ اسرارِ صوفیہ میں سے آتا ہے مگر میں اس کو بلا دو عادل گواہوں کے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ ﷺ ہے قبول نہیں کرتا، اور ابو سعید خراز کا قول ہے: **کل باطن یخالفہ الظاھر فھو باطل** جو باطن کہ ظاہر کے خلاف ہو وہ باطل اور مردود ہے۔ (عنوان ''الہام'' سے اس جگہ تک ''شریعت وطریقت'' سے ماخوذ ہے جو حضرت تھانویؒ کے افادات وتالیفات سے مرتب کی گئی ہے)

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرات صوفیہ کے بیان کردہ حقائق ومعارف جہاں بظاہر کسی نص سے ہٹے ہوئے نظر آئیں فوراً ان کا انکار کر دیا جائے، اس میں بہت تامل اور احتیاط سے کام لینا چاہیئے، بعض اوقات آدمی کسی آیت یا حدیث کا صحیح مطلب نہیں سمجھ پاتا اور اپنے ذہن ودماغ سے اس کا کوئی مطلب اخذ کر لیتا ہے، اور پھر اسی کو معیار بنا کر علماء وفقہاء کے اقوال کو رد کرتا ہے، اور بزعم خویش یہ سمجھتا ہے کہ میرا استدلال قرآن وسنت سے ہے، حالانکہ اس کا مستدل اس کی اپنی فہم ہے، یہ مصیبت ہمارے اس زمانہ میں بہت عام ہے، عموماً لوگ سنجیدگی اور عقلی توازن کے ساتھ قرآن وحدیث پر غور نہیں کرتے، یہ لوگ دوڑتے بھاگتے مختلف مشاغل اور گوناگوں افکار وخیالات میں گرفتار سرسری نظر سے کسی آیت یا حدیث کا کوئی

مفہوم اخذ کر لیتے ہیں بس اسی کو حرف آخر سمجھ کر قرآن وحدیث کا درجہ دیدیتے ہیں، حالانکہ یہ ان کا قصورِ فہم تھا، اس ذہنی طغیان نے نہ جانے کتنے حقائق وعلوم کو فنا کر کے رکھ دیا ہے۔

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی مشائخ اور صوفیہ کی زبان نہیں سمجھتا، یہ حضرات کوئی لفظ بولتے ہیں اور اس کا کوئی مخصوص معنی ان کے نزدیک متعین ہوتا ہے، لیکن پڑھنے اور سننے والا اس کا اصطلاحی معنی نہیں جانتا وہ اس لفظ کو اس کے لغوی یا عرفی معنی میں مراد لے لیتا ہے اور غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے، ایسی غلطیاں ہر فن میں غیر اہل فن سے ہوتی رہتی ہیں اور اہل علم ان کی تصحیح کر دیا کرتے ہیں مگر اہل تصوف پر اس باب میں بہت ظلم ہوا ہے، لوگ تصوف کے حقائق ومسائل سے عموماً آگاہ نہیں ہیں یہ لوگ تصوف کی اصطلاحات کو کسی اور معنی میں لے کر اس کی تردید کرنے لگ جاتے ہیں۔

اس لئے خوب غور کر لینا چاہئے کہ محققین صوفیاء ومشائخ جنھوں نے اپنی تمام تر زندگی اپنے سارے اوقات اور اپنا دل ودماغ، جسم واعضاء اور ذہانت وذکاوت بلکہ تمام راحت وآرام رضاء الٰہی کے لئے قربان کر دیا ہے، ان کی زبان وقلم سے نکلا ہوا کوئی علم آسان نہیں ہے کہ رد کیا جائے، اگر کہیں اشکال ہو تو رد کرنے سے پہلے غور وتامل سے اس کا مطلب سمجھ لینا چاہئے، اہل فن سے پوچھ لینا چاہئے تاکہ اس کے سمجھنے میں کوئی قصور واقع نہ ہو، پھر یہ بھی دیکھ لینا چاہئے کہ قرآن وحدیث کی جس نص سے یا قاعدے سے ہم اسے رد کر رہے ہیں اس کا بھی وہی مفہوم ہے جو ہم نے سمجھا ہے، جب اس کا خوب اطمینان ہو جائے اور علماء فن سے اس کی تصدیق ہو جائے تب رد کرنے میں کوئی حرج نہیں اور نہ ان حضرات کے مقابلے میں اپنے کو قصور فہم اور قلت تتبع کے ساتھ متہم کرنا زیادہ مناسب ہے، مخلص اہل علم کو اس کا خوب تجربہ ہے کہ بعض اوقات قرآن واحادیث کے ظاہر سے ایک مفہوم ذہن میں آتا ہے، مگر جب کوئی محقق اور دقیقہ رَس صاحب علم اس کا صحیح مفہوم بیان کرتا ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ جو کچھ پہلے سمجھا گیا تھا وہ کس قدر بے بنیاد تھا۔ **واللّٰہ الموفق**

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

علماءِ مظاہر اور تصوف و سلوک

تصوف کیا ہے؟ یہ سوال رئیس الاحرار مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی علیہ الرحمہ نے شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا کاندھلوی نوراللہ مرقدہٗ سے کیا تھا۔ اور شیخ نے اس کا ایک نہایت مختصر اور جامع جواب دیا تھا۔ مختصر اتنا کہ چند سطروں میں لکھ لیجئے، اور جامع اتنا کہ اس میں تصوف و سلوک اور احسان و عرفان کی تمام وسعتیں سما گئی ہیں۔ آپ اس داستان کو خود حضرت شیخ الحدیث صاحب کے سادہ اور بے تکلف الفاظ میں پڑھئے، شیخ نے اپنی املائی کتاب آپ بیتی میں اس سوال وجواب کو درج فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

> ''ایک مرتبہ دس بجے صبح کو میں اوپر اپنے کمرے میں نہایت مشغول تھا، مولوی نصیر نے اوپر جا کر کہا کہ رئیس الاحرار آئے ہیں رائے پور جا رہے ہیں، صرف مصافحہ کرنا ہے، میں نے کہا جلدی بلا دے، مرحوم اوپر چڑھے اور زینے پر چڑھتے ہی سلام کے بعد مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا کر کہا، رائے پور جا رہا ہوں، اور ایک سوال آپ سے کر کے جا رہا ہوں پرسوں صبح واپسی ہے، اس کا جواب آپ سوچ رکھیں، واپسی میں جواب لوں گا، یہ تصوف کیا بلا ہے؟ اس کی کیا حقیقت ہے؟ میں نے مصافحہ کرتے کرتے یہ جواب دیا کہ صرف تصحیح نیت، اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتدا **انما الاعمال بالنیات** سے ہوتی ہے اور انتہا **ان تعبد اللہ کانک تراہ** ہے''

دوسری ملاقات میں حضرت شیخ الحدیث رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا مرحوم سے فرمایا:

> ''**انما الاعمال بالنیات**'' سارے تصوف کی ابتدا ہے اور ''**ان تعبد اللہ کانک تراہ**'' سارے تصوف کا منتہا ہے، اسی کو ''نسبت'' کہتے ہیں، اسی کو ''یاد

> داشت'' کہتے ہیں، اسی کو ''حضوری'' کہتے ہیں''۔
>
> حضوری گرہمی خواہی ازو غافل مشو حافظ
> **متیٰ ماتلق من تھویٰ دع الدنیا وأمھلھا**
>
> مولوی صاحب! سارے پاپڑ اسی کے لئے بیلے جاتے ہیں، ذکر بالجہر بھی اسی واسطے ہے، مجاہدہ و مراقبہ بھی اسی واسطے ہے، اور جس کو اللہ جل شانہٗ اپنے لطف و کرم سے کسی بھی طرح سے یہ دولت عطا فرما دے، تو اس کو کہیں بھی ضرورت نہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر کیمیا اثر سے ایک ہی نظر میں سب کچھ ہو جاتے تھے، ان کو کسی چیز کی ضرورت نہ تھی، اس کے بعد اکابر اور حکماء امت نے قلبی امراض کی کثرت کی بنا پر مختلف علاج، جیسا کہ اطبا بدنی امراض کے لئے تجویز کرتے ہیں، روحانی اطبا نے روحانی امراض کے لئے ہر زمانے کے مناسب اپنے تجربات سے جو اسلاف کے تجربات سے مستنبط تھے نسخے تجویز فرمائے، جو بعضوں کو بہت جلد نفع پہونچاتے ہیں، اور بعضوں کو بہت دیر لگتی ہے۔ (۴۹-۵۰/۱۸)

حضرت شیخ الحدیث صاحب نور اللہ مرقدہٗ نے تصوف کی تعریف تصحیح نیت سے کی اور اس کی ابتداء اور انتہاء کے لئے دو حدیثوں کا حوالہ دیا۔ تصحیح نیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کا ہر عمل خواہ اس کا تعلق بدن سے ہو یا قلب و دماغ سے، دوسرے لفظوں میں کہہ لیجئے کہ اس کی ساری زندگی محض اللہ کے لئے ہو جائے، اس میں غیر کی نیت کا شائبہ بھی نہ ہو، اس کی صراحت قرآن کریم کی ایک آیت میں بہت واضح ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے '' **قل ان صلاتی و نسکی و محیای و مماتی للہ رب العالمین لا شریک لہ و بذلک امرت و انا اول المسلمین** (سورہ انعام:۱۶۲/۱۶۳) تم کہو کہ بیشک میری نماز، میری قربانی، میری زندگی اور میری موت سب صرف اللہ کے لئے ہے، جو سارے جہاں کا پالنہار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے، اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں پہلا مسلم ہوں۔

اس آیت میں انسان کا مقصد حیات بیان کیا گیا ہے، کہ وہ محض اللہ کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی ہے، زندگی کی تمام حالتوں میں آدمی اپنا رخ جب اس مقصد کی طرف رکھنے کا اہتمام کرتا ہے، تو یہی ''تصحیح نیت'' کا عمل ہے، یہ پوری زندگی کا عمل ہے، عقل وشعور حاصل ہونے کی عمر سے دم باز پسیں تک یہ عمل محیط ہے، یہی تصوف کا مبدأ اور منتہا ہے۔

مبدأ اس طرح ہے کہ ابتداءً تکلف کر کے طبیعت پر علم اور عقل کا دباؤ ڈال کر آدمی اپنے کو اور اپنے اعمال کو حکم خداوندی کا پابند بنائے، بغایت احتیاط رکھے کہ کوئی کام بجز تعمیل ارشاد خداوندی اور بجز جذبۂ رضاء الٰہی کے صادر نہ ہو، نہ عمل، نہ قول، نہ حال، نہ عادت، نہ عبادت، نہ حرکت، نہ سکون، نہ محبت، نہ بغض، نہ خرچ، نہ امساک، نہ تکلم، نہ سکوت۔ غرض تفصیلاً زندگی کے ہر لمحہ کو ہر جذبہ سے برطرف کر کے اللہ ہی کے ساتھ وابستہ کرے، شروع میں قدم قدم پر پاؤں ڈگمگائیں گے خیالات بہکیں گے، جذبات غلط روی اختیار کریں گے، نیت ادھر ادھر منتشر ہوگی، ذہن کی آوارگی پریشان کرے گی، لیکن آدمی جب مسلسل اس کی مشق استقامت کے ساتھ جاری رکھتا ہے، اور کسی رہبر ورہنما کی سرپرستی میں لگا رہتا ہے، تو آہستہ آہستہ اس کیفیت کا رسوخ ہوتا جاتا ہے، پھر ایسا ہو جاتا ہے کہ یہی کیفیت ایک دائمی حال بن جاتی ہے، پھر مزید رسوخ کے بعد فطرت ثانیہ بن جاتی ہے، اب اس کا نام حدیث کی اصطلاح کے مطابق احسان ہو جاتا ہے۔

اسی بات کو حضرت شیخ الحدیث صاحب نے فرمایا کہ تصوف صرف تصحیح نیت ہے، اس کے سوا کچھ نہیں، جس کی ابتدا **انما الاعمال بالنیات** سے ہوتی ہے، اور انتہا **ان تعبد اللہ کانک تراہ** ہے۔ جو لوگ احادیث پر نظر رکھتے ہیں، وہ ان دونوں حدیثوں سے، جن کا حوالہ شیخ نے دیا ہے، بخوبی واقف ہیں، لیکن افادۂ عام کے لئے ہم اپنے موضوع کی ضرورت کے بقدر دونوں حدیثوں کے کچھ اجزا کا ذکر کرتے ہیں۔

پہلی حدیث جسے شیخ نے تصوف کی ابتدا کے طور پر پیش کیا ہے، صحیح بخاری شریف کی پہلی حدیث ہے، جسے سیدنا الامام البخاری علیہ الرحمہ نے اپنی الجامع الصحیح کا سرنامہ بنایا ہے۔

یہ حدیث امیر المؤمنین سیدنا عمر فاروق بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ’’**انما الاعمال بالنیات و انما لکل امرئ ما نوی**‘‘ عمل کا مدار نیت پر ہے، اور ہر شخص کے لئے وہی چیز ہے، جس کی اس نے نیت کی ہے۔

اس اصولی بات کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ایک مثال بھی ذکر فرمائی ہے، کہ جس شخص نے ہجرت کی اور اس کی نیت صرف اللہ ورسول کی جانب ہجرت کی ہے، یعنی اس نے وطن اور مال اور اہل وعیال کو محض اللہ کی رضا جوئی اور رسول کی تعمیل حکم میں چھوڑا تو بے شک اس کی ہجرت اور اس کا وطن چھوڑنا اللہ ورسول کے لئے ہے، اور جس نے وطن اس لئے چھوڑا کہ دنیا حاصل کرے گا اور دولت کمائے گا، کسی عورت سے نکاح کرے گا، تو اس کی ہجرت کا حاصل بس یہی ہے کہ اسے دولت مل جائے یا اس کا مطلوبہ عورت سے نکاح ہو جائے۔

اعمال کو صحیح نیت کے ساتھ مربوط کرنے کی سعی وکوشش سے تصوف کا عمل شروع ہوتا ہے، یہ محنت جاری رہتی ہے تو پھر وہ درجہ انسان کو میسر آتا ہے، جس کا ذکر دوسری حدیث میں ہے۔

یہ دوسری حدیث جسے شیخ نے تصوف کا منتہا فرمایا ہے، صحیح مسلم شریف کی پہلی حدیث ہے، اور اس کے بھی راوی امیر المومنین سیدنا عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ہی ہیں، یہ ایک مفصل اور طویل حدیث ہے، جو حضرات محدثین کے درمیان حدیث جبریل کے عنوان سے معروف ہے۔

حضرت جبرئیل امین علیہ السلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات کے دور اخیر میں آپ کی خدمت میں بصورت انسان تشریف لائے، اور آپ سے پانچ سوالات کئے، جن کے جواب آپ نے دیئے۔ ان میں تیسرا سوال یہ تھا کہ ’’**ما الاحسان**‘‘ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ’’**ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک**‘‘ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی عبادت اس طرح کرو، گویا تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے نہیں دیکھ

رہے ہوتو وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔

آدمی کے قلب کی اور اس کے استحضار کی یہ کیفیت ہو جائے کہ وہ خود کو خدا کے سامنے اس طرح پائے جیسے اسے دیکھ رہا ہو، اس کیفیت کے بعد اس کی غفلت ختم ہو جاتی ہے وہ ہمہ دم ذاکر ہو جاتا ہے، یہی کیفیت صوفیہ کی اصطلاح میں نسبت کہلاتی ہے، اسی کو یادداشت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

تصحیح نیت کی ابتدا اخلاص کا آغاز ہے، یہ مشق اتنی بڑھتی ہے کہ دوام حضور کی کیفیت راسخ ہو جاتی ہے یہ مرتبۂ احسان ہے، اس پورے عمل کا نام تصوف ہے، اس کے حاصل ہونے کے بعد آدمی سراپا اخلاص بن جاتا ہے، اس کی زندگی ایک پاکیزہ اور اعلیٰ زندگی بن جاتی ہے، اس کے ظاہر و باطن میں ایسی نورانیت پیدا ہوتی ہے کہ جہاں اس کے قدم پڑتے ہیں برکتوں اور رحمتوں کا خزانہ ابل پڑتا ہے۔

تصوف از اول تا آخر دین و شریعت کی خدمت ہے، اس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی طبعی احوال و خصائل بن جاتے ہیں، اب شریعت کے احکام، احکام تکلیفیہ نہیں رہتے، انسان کے فطری اور طبعی تقاضے ہو جاتے ہیں، جن پر عمل کرنے میں اور ممنوعات سے پرہیز کرنے میں آدمی کو تکلف باقی نہیں رہتا، یہ ملکہ ہر زمانے میں لوگوں نے حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، اس کیلئے جو چیز سب سے موثر اور قوی ترین عامل ثابت ہوتی ہے وہ عقیدت و محبت کے ساتھ صحبت و معیت شیخ ہے، محض عقیدت ہو اور صحبت و معیت نہ ہو تو بات کچھ ادھوری رہ جاتی ہے، یا صحبت و معیت ہو لیکن محبت و عقیدت نہ ہو تو معاملہ بگڑ جاتا ہے۔

یہ نکتہ معلوم تو سب کو ہے، جس کو بھی علم اور عقل سے کچھ تعلق ہے اس کو اس کا ادراک ضرور ہے لیکن ہر ایک کو اس کا حوصلہ نہیں ہوتا، وہ عقیدت کو احساس کمتری سمجھتا ہے، یا صحبت کو دلیل عجز قرار دیتا ہے، بعض لوگوں کو حوصلہ تو ہوتا ہے، مگر اسباب میسر نہیں آتے، تو حوصلہ ارادۂ و عمل کی منزل تک نہیں پہونچتا، بڑا ہی خوش قسمت انسان ہے وہ جو حوصلہ بھی رکھتا ہو، اسے ایسے اسباب بھی مل جائیں، جن کے واسطے سے ارادہ و عمل تک وہ پہونچ سکے، اور پھر اسے

توفیق بھی مل جائے پھر دین میں وہ کیا مرتبہ پائے گا اس کا اندازہ کرنا بھی آسان نہیں ہوتا۔

بزرگان پیشین نے اس راہ میں کیا کیا کاوشیں کی ہیں اسکی داستان اس امت کی زرخیزی، مقبولیت اور عظمت کی روشن دلیل ہے، ہم زمان ومکان کی طول طویل مسافتیں سمیٹ کر ماضی قریب کے ان علماء ومشائخ کی خدمت میں حاضری دینا چاہتے ہیں، جنہوں نے خطۂ پاک سرزمین دیوبند، سہارنپور میں دین اور علم دین کے دو ایسے مضبوط قلعے تعمیر کئے کہ آج بھی ان کے حصار میں تعلیم وتربیت سے آراستہ ہوکر خادمان دین کی فوجیں نکلتی ہیں، اور یہ فوجیں نئے نئے قلعے تعمیر کرتی اور دین کی حفاظت کا اہتمام کرتی ہیں۔

مجھے عرض کرنا یہ ہے کہ جن بزرگوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے زوال کے بعد دین اسلام کی حفاظت وصیانت کے لئے منجانب اللہ ایک ایسے راستے کی ہدایت پائی جس میں سیاسی تصادم کا امکان کم سے کم تھا، لیکن اسلامی معاشرے کی بقا وحفاظت کا بہترین انتظام تھا، یہ بزرگ جہاں علم وفضل کے بہت بلند مقام پر فائز تھے، وہیں تصوف وروحانیت سے انہیں خصوصی دلچسپی تھی، بلکہ دیکھا جائے تو یہی چیز ان کی شناخت بن گئی تھی۔

میں اگر حضرت شاہ ولی اللہ المحدث الدہلوی اور ان کے بلند پایہ صاحبزادگان و احفاد، حضرت مرزا مظہر جان جاناں اور ان کے عالی مقام خلفاء کے سلسلے کا ذکر کروں، تو یہ مقالہ کتاب کی شکل اختیار کرلے گا۔ یہ سب حضرات جہاں علم حدیث وفقہ اور منقولات و معقولات کے بلند رتبہ علماء تھے، وہیں تصوف وروحانیت کے عظیم سالک بھی تھے، اور ان کی زندگی میں محبت الٰہی اور عشق نبوی کے ذوق کی حلاوت جو کچھ تھی اسی تصوف وسلوک کی برکت سے تھی، انہیں دونوں مراکز علم وروحانیت سے فیض پاکر چند بڑے درجے کے بزرگ اور علماء اٹھے اور اللہ کے حضور سے انھوں نے دو توفیق پائی کہ ملت اسلامیہ کی رگوں میں از سر نو خون گرم رواں دواں ہو۔ فقیہ سہارنپور حضرت مولانا سعادت علی صاحب، سید الطائفہ حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، فخر المتاخرین حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، سرتاج

محدثین حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، مظہر علوم حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی، یہ وہ اکابر ہیں جن کی ظاہری و باطنی توجہات سے دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور کی شکل میں عظیم الشان دینی قلعے تعمیر اور آباد ہوئے، علماء دیوبند ہوں یا علماء مظاہر سب کا ذوق مشترک ہے۔

درکفے جام شریعت درکفے سندان عشق

ایک ہاتھ میں علوم شریعت، ایک ہاتھ میں معرفت وروحانیت، یہ دونوں چیزیں بہم ہوتی ہیں تو انسانیت معراج کمال کو پہنچتی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جہاں اللہ کی جناب سے دستور وقانون شریعت لائے تھے، وہیں روحانیت ومحبت کی دلآویزی بھی لائے تھے، ایک طرف عبادتوں کا ظاہری ڈھانچہ ہے، جس کو خوبصورت سے خوبصورت بنایا ہے، تو دوسری طرف احسان یعنی ”**ان تعبد الله كانك تراه**“ کے ذریعے اس میں روح پہنچائی ہے، یہ روح نہ ہوتو ڈھانچہ بے دم ہوگا، اور ڈھانچہ نہ ہوتو تنہا روح بے چاری کالعدم ہوگی۔

ہمارے علماء نے ان دونوں کا حق ادا کرنے کی سعی مشکور کی ہے، یہ بہت طویل اور روح پرور داستان ہے، اس کے تصور سے ایمان بڑھتا ہے، دل میں تازگی آتی ہے، روح جھوم اٹھتی ہے، اور حسرت ہوتی ہے کہ کاش ان حضرات کی زندگی کا ایک لمحہ بھی میسر آجاتا، تو بے جان ڈھانچوں میں جان آجاتی۔

یہ حضرات علم وعقل اور ذہانت کے پہاڑ تھے، مگر ذوق عبودیت نے انہیں اس حال میں پہونچا دیا تھا کہ دیکھنے والا اندازہ نہیں کرسکتا تھا کہ یہ کس بلندی پر قدم جمائے ہوئے ہیں۔

جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کے بانی ومعمار اول حضرت مولانا سعادت علی صاحب نوراللہ مرقدہٗ، امیر المؤمنین حضرت سید احمد شہید قدس سرہٗ کی بابرکت اور مقدس جماعت کے مخصوص ترین افراد میں تھے، علم فقہ میں مولانا کو خصوصی مہارت تھی اور فقیہ سہارنپور ان کا لقب تھا، سید صاحب کے قافلے میں ہونا ہی ان کے روحانی کمالات کی اور سلوک وطریقت

میں بلند پایہ ہونے کی دلیل ہے، یہ قافلہ دور اخیر میں قرون اولیٰ کے مسلمانوں کا نمونہ تھا۔ اس میں بڑی تعداد بلند پایہ علماء کی تھی، امراء اور روساء کے صاحبزادوں کی تھی، مگر محبت الٰہی میں اور کلمۃ اللہ کی سربلندی کے جذبے میں ہر ایک اتنا سرشار اور جان نثار تھا کہ ظاہری حیثیت سے پتہ لگانا دشوار تھا کہ کون کس مرتبہ کا ہے، سب کو بس ایک ہی دھن تھی، وہ اللہ کی رضا جوئی اور اس کی خوشنودی، ان لوگوں کو یہی ہوش تھا اس کے علاوہ تن بدن تک کا خیال نہ تھا۔

حضرت سید صاحب اپنے قافلہ کے ساتھ حج کے لئے تشریف لے جارہے تھے کلکتہ پہونچے، تو وہاں کے ایک سربرآوردہ اور مال دار ترین شخص منشی امین الدین صاحب نے آگے بڑھ کر لشکر کا استقبال کیا، اس قافلہ میں ہندوستان کے مایۂ ناز اور مشہور و معروف عالم، خانوادۂ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کے گل سرسبد حضرت مولانا شاہ محمد اسماعیل صاحب بھی موجود تھے، ان کے علم و فضل اور ذہانت و ذکاوت کی دھوم پورے ہندوستان میں تھی۔

منشی امین الدین نے حضرت سید صاحب سے مولانا محمد اسماعیل صاحب کے بارے میں دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں؟ انہیں بلوایا گیا، وہ اسی طرح میلے کچیلے پرانے سفری کپڑے پہنے اپنی کشتی سے اتر آئے، اور حضرت سید کی طرف بڑھے، لوگوں نے منشی صاحب سے کہا مولوی اسماعیل صاحب آتے ہیں، انہوں نے اس طرف دیکھ کر کہا کہاں آتے ہیں؟ لوگوں نے ان کی طرف اشارہ کیا وہ آتے ہیں، منشی صاحب نے جانا کہ یہ مولوی محمد اسماعیل صاحب کوئی اور ہوں گے، کہا میں ان مولوی محمد اسماعیل صاحب کو پوچھتا ہوں جو مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب کے بھتیجے ہیں، لوگوں نے کہا یہ وہی ہیں، منشی صاحب آبدیدہ ہو کر تعجب میں رہ گئے (سیرت سید احمد شہید ۳۱۹/۱)

حضرت شاہ محمد اسماعیل صاحب شہید کی یہ سادگی اور بے نفسی اسی نسبت باطنی کا ایک جلوہ تھا، جو انہیں تصوف و سلوک کی راہ سے حاصل ہوئی تھی۔

حضرت سید صاحب نے جب انگریزوں کی عمل داری سے ہجرت کی تھی، تو اثناء راہ میں مختلف مقامات میں پڑاؤ ڈالا تھا، صوبۂ سندھ سے جب گزر رہا تو ایک مشہور قوی النسبت

بزرگ حضرت سید حسن شاہ جیلانی کی خانقاہ میں بھی قیام فرمایا تھا۔ اس خانقاہ میں دو شیران حق اس وقت زیر تربیت تھے، ان میں ایک عالی مقام بزرگ حضرت حافظ محمد صدیق صاحب بھی تھے جو آگے چل کر اس علاقے کے نامور بزرگ ہوئے، اور بڑے بڑے علماء و مشائخ نے ان کی خدمت میں تربیت پائی، وہ فرماتے ہیں کہ:

> جس وقت جماعت مجاہدین سوئی شریف حضور مرشد کے ہاں آئی تو بندہ اس وقت حضور کے لنگر میں رہتا تھا، حضرت مولانا محمد اسماعیل شہید اس سفر میں مجاہدین کے اونٹ چرایا کرتے تھے، ایک بار بعد عصر مسجد شریف میں حضور مرشد اور حضرت سید احمد شہید کے درمیان فرضیت جہاد کے متعلق مذاکرہ ہو رہا تھا، دونوں بزرگ اپنے اپنے علم و کمال کے موتی لٹا رہے تھے، اتنے میں حضرت سید صاحب نے کسی کو فرمایا کہ جاؤ میاں محمد اسماعیل کو بلا لاؤ، اس وقت حضرت مولانا سوئی شریف کے باہر اونٹوں کے ساتھ پھر رہے تھے، ٹخنوں کے اوپر پاجامہ تھا، اور کندھوں پر اونٹوں کی مہاریں اور رسیاں تھیں، آپ اسی وقت اسی حالت میں مسجد میں حاضر ہوئے، اور دونوں بزرگوں کے سامنے باادب کھڑے ہوگئے، حضرت سید صاحب نے زیر بحث حدیث کی تشریح بیان کرنے کے متعلق ارشاد فرمایا، شاہ صاحب نے اس قدر دل پذیر تقریر فرمائی، حدیث کے مضامین، ان پر اشکالات و اعتراضات پھر ان کے جوابات بیان کئے، نیز اسماء الرجال پر بحث ایسے مختصر اور بلیغ انداز میں کی کہ وہ مسئلہ چٹکیوں میں حل ہوگیا، علم کے اس بحر بے پایاں کی تقریر کے دوران ایسا معلوم ہوتا تھا، کہ اس شخص نے زندگی بھر میں صرف یہی ایک حدیث پڑھی اور اس پر تحقیق کی ہے۔ (تذکرہ شیخ ہالیجوی ۵۰)

بانی مظاہر علوم حضرت مولانا سعادت علی صاحب اسی پاکباز قافلے کے ایک مقدس فرد تھے، سہارنپور قیام کے دوران اپنے ذکر اور معمولات احسان و سلوک کے دوران مسلمانوں میں علوم دین کی تعلیم کا جذبہ بھی دل میں جوش زن رہتا تھا، جیسا کہ حضرت سید صاحب کے بیشتر خلفاء و متوسلین پر یہی رنگ غالب تھی۔

حضرت مولانا سعادت علی صاحب اپنے دولت کدہ پر قدیم طرز کے مطابق شائق طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، مولانا کو بار بار یہ ولولہ ہوتا تھا کہ باقاعدہ دینی مدرسہ ہونا چاہئے، گاہ بگاہ اس کا تذکرہ بھی فرماتے رہتے تھے۔ ۱۵ محرم ۱۲۸۳ھ کو دارالعلوم دیوبند کی بنیاد پڑی، تو اس کے چھ ماہ بعد یکم رجب ۱۲۸۳ھ کو چوک کی مسجد میں مدرسہ کا آغاز فرمادیا۔

یہ دور وہ تھا اور بزرگوں کے صحبت کی برکت تھی کہ مدرسہ کے بیشتر افراد اللہ کے نام کے ذوق آشنا تھے، ہر شخص کا دامن کسی نہ کسی صاحب نسبت بزرگ سے بندھا ہوا تھا، اور وہ ان کی نگرانی اور تربیت میں اپنے قلب کو کیفیت احسانی سے سرشار کئے ہوئے تھا، کوئی عالم مکمل عالم اس وقت تک سمجھا نہ جاتا تھا، جب تک کسی اللہ والے سے اسے ارادت نہ ہو، اگر وہ بزرگ سے باقاعدہ بیعت نہ بھی ہوتا تو بھی صاحب نسبت اساتذہ کی نسبت کا پرتو اس میں جگمگاتا ہوتا۔

حضرت مولانا سعادت علی صاحب علیہ الرحمہ کے بعد جو نام مظاہر علوم کے بنیادی لوگوں میں سب سے ممتاز ہے، جن کے زمانے میں مظاہر علوم کی باقاعدہ عمارت کی تعمیر ہوئی، اور انہیں کے نام سے اخذ کر کے گویا اس کا تاریخی نام مظاہر علوم رکھا گیا، وہ بزرگ شخصیت حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی قدس سرہ کی ہے۔

جس طرح بانی مدرسہ حضرت مولانا سعادت علی صاحب فقیہ سہارنپور، حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے اونچی نسبت کے حامل تھے، اسی طرح حضرت مولانا محمد مظہر صاحب نانوتوی بھی بڑی نسبت کے حامل تھے، وہ حضرت مولانا مملوک العلی نانوتوی اور حضرت شاہ عبدالغنی مجددی کے شاگرد تھے، مزید یہ کہ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کے ابتدائی کتابوں کے استاذ تھے، مگر اس کے ساتھ قلب کی تواضع اور بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ انھوں نے حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی قدس سرہ کو اپنا ایک خواب لکھا کہ۔

”ایک تخت ہے جس کے صدر پر حضرت (مولانا رشید احمد) گنگوہی اور

حضرت (مولانا قاسم) نانوتوی تشریف رکھتے ہیں‘‘

مولانا نے یہ خواب ایک عریضہ میں لکھا اور ساتھ ہی بیعت کی درخواست بھی کی۔ حضرت شیخ الحدیث صاحب لکھتے ہیں:

> ۱۲۹۲ھ میں اس مکان کا اکثر حصہ تکمیل کو پہونچ گیا، جو گذشتہ سال سے زیر تعمیر تھا مدرسہ کا تاریخی نام بناء کے لحاظ سے مظہر علوم ہے، اور تکمیل کے لحاظ سے مظاہر علوم تجویز ہوا، اور اسی سال سے وہ مظاہر علوم کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نام میں ایک ہلکا سا اشارہ حضرت اقدس مولانا محمد مظہر صاحب کے اسم گرامی کی طرف بھی ہے، جو حقیقۃ مدرسہ کے روح رواں اور مربی تھے، اس لئے مدرسہ اپنے وجود میں آنے کے بعد سے آج تک حضرت ممدوح ہی کی تربیت میں نشو ونما پایا (تاریخ مظاہر، ۱/ ۴۸)

حضرت حاجی صاحب نے خواب کی تعبیر یہ تحریر فرمائی کہ دونوں میں سے کسی سے بیعت ہو جایئے، حضرت مولانا یہ خط لے کر حضرت نانوتوی کے پاس پہونچے کہ مجھے بیعت کر لیجئے، حضرت نانوتوی شاگرد ٹھہرے وہ گھبرا گئے، عرض کیا آپ ہی مجھے بیعت کر لیجئے، فرمایا لیجئے یہ خط ہے اور یہ حکم ہے، حضرت نانوتوی نے فرمایا کہ میں آپ کو صحیح مشورہ دیتا ہوں کہ گنگوہ تشریف لے جائیں، مولانا وہاں گئے اول تو حضرت گنگوہی نے بھی معذرت کی، مگر پھر بیعت کر لیا، (ارواح ثلاثہ بروایت حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب)

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب حضرت گنگوہی سے عمر میں بڑے تھے، مگر اللہ اکبر یہ تواضع اور یہ فروتنی! حضرت گنگوہی کا بہت ادب کرتے، اور حضرت گنگوہی بھی ان کا بہت احترام کرتے، حضرت گنگوہی قدس سرہ سے انھوں نے اجازت وخلافت بھی پائی۔

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب جیسا کہ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ اطلاع دیتے ہیں بکثرت تلاوت قرآن کرتے تھے، آپ کی زبان مبارک پر اسم ذات اللہ اللہ کا ذکر مسلسل جاری رہتا تھا، تکلفات سے بہت دور بالکل سادہ زندگی بسر کرتے تھے، لیکن اس کے باوجود خداداد رعب کا یہ عالم تھا کہ لوگوں کو ان کے سامنے بات

کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی، مولانا صاحب زہد وتقوی والے علماء میں تھے، بڑے بزرگوں میں تھے، ساتھ ہی ساتھ فقہ، حدیث اور سلوک وتصوف نیز علوم آلیہ میں امامت کا درجہ رکھتے تھے، تراویح میں قرآن کریم کی تلاوت کے وقت انہیں خوشبو لگانے کا بڑا اہتمام تھا، ۲۴؍ذی الحجہ ۱۳۰۲ھ کو وصال ہوا۔

حضرت مولانا کی وفات بھی ان کے صاحب نسبت مومن ہونے کی روشن علامت تھی، حدیث شریف میں وارد ہے کہ **المومن یموت بعرق الجبین** (نسائی شریف، کتاب الجنائز) مومن پیشانی کے پسینے کے ساتھ مرتا ہے، مولانا مرض الوفات میں بار بار اپنی پیشانی پر ہاتھ پھیرتے تھے، انھیں تلاش تھی کہ پیشانی پر پسینہ آرہا ہے یا نہیں؟ جب نزع کا وقت ہوا تو ان کی پیشانی پر پسینے کی قطرات پھیلنے لگے، اس کو محسوس کر کے خوشی سے ان کا چہرہ دمک اٹھا کہ ایمان کی علامت نمودار ہوئی۔ (مقدمہ اوجز المسالک/ ٦٧)

حضرت مولانا محمد مظہر صاحب ۱۸۵۷ء کے جہاد میں شریک تھے، وہاں ان کے ساتھ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو بڑا ہی روح پرور ایمان افروز ہے، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی علیہ الرحمہ اس کے راوی ہیں، فرماتے ہیں۔

> ”مجھ سے ہردوئی میں ایک شخص نے بیان کیا کہ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب بہت کثرت سے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرتے رہتے تھے، کسی کے اصرار کے ساتھ دریافت کرنے پر فرمایا کہ ۱۸۵۷ء میں میں بھی جہاد میں شریک تھا، مجھے گولی لگی اور میں گر گیا، اسی حال میں دیکھا کہ حوریں شربت کے گلاس لئے ہوئے آئیں اور شہیدوں کو پلانا شروع کر دیا، ایک گلاس میرے سامنے بھی لایا گیا، میں نے جس وقت اس کو منہ لگایا، اور میرا لب تر ہوا تو دوسری نے یہ کہہ کر وہ گلاس ہٹا لیا کہ ابھی اس کی حیات باقی ہے، یہ ان میں سے نہیں ہے، وہ لذت ہونٹوں پر اب بھی باقی ہے، جو مجھے چین نہیں لینے دیتی“۔ (علماء مظاہر ج۱/ ٤٦)

سبحان اللہ! کیا لوگ تھے کہ جیتے جی جنت کی لذتوں کا لطف حاصل ہوا، اور تا زندگی

باقی رہا، ایسے لوگوں کو موت کا شوق اور انتظار کس درجہ رہا ہوگا، ساری زندگی گویا اسی آرزو میں گزاری کہ کب وہ وقت آئے گا زندگی مستعار کا یہ حجاب ٹوٹے گا، اور جس لطف وحلاوت کی صرف چاشنی ملی تھی، وہ اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ نصیب ہوگی۔(۱)

ہمارے یہ بزرگ دور اخیر میں قرون اولی کے نمونے تھے، انہیں دیکھ کر صحابہ کرام کی زندگی سمجھ میں آتی ہے کہ جب پچھلوں کا یہ حال ہے، تو اگلوں کا کیا رنگ رہا ہوگا، یہ حضرات کسی کے نہ تھے، نہ اپنے نہ دوسروں کے صرف اللہ کے تھے، صرف رسول کے تھے، ایک عہد وفا باندھا تھا، اسے ہر جتن سے پورا کیا۔

یہ دنیاوی وجاہت کے لحاظ سے بہت عالی مرتبہ تھے، مگر جب اللہ کیلئے خود کو مٹایا، تو انھیں شاید کبھی احساس نہیں ہوا کہ وہ کس حیثیت کے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ علم کا اور معرفت الٰہی کا اثر جب دل پر آتا ہے تو تمام ظاہری نمود ونمائش کے تمام مظاہر فنا ہوجاتے ہیں۔

مظاہر علوم کے بالکل ابتدائی طالب علموں میں حضرت مولانا عنایت الٰہی صاحب سہارنپوری علیہ الرحمہ تھے، جو نہایت ذہین وفطین اور امتیازی صلاحیت کے مالک تھے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب محدث سہارنپوری قدس سرہٗ کے ہم سبق تھے، بعد میں مدرسے کے مہتمم بھی ہوئے، زمانۂ اہتمام میں مدرسہ کے کسی عدالتی کام سے انھیں کچہری جانے کا اتفاق ہوا، مولانا کی سادگی کا عالم یہ تھا کہ آپ کے بدن پر کچھ بیش قیمت لباس نہیں دیکھا گیا، ظاہری ہیئت سے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ یہ صاحب مدرسہ مظاہر علوم کے مہتمم ہوں گے۔

عدالت میں پیشی کے وقت آواز لگائی گئی مہتمم مدرسہ مظاہر علوم! مولانا آواز سن کر کمرۂ عدالت میں تشریف لے گئے، حاکم نے ترش رو ہوکر کہا کہ مدرسہ کے مہتمم کو بلایا گیا

---

(۱) ایک حدیث میں ہے کہ **ذاکر اللّٰہ فی الغافلین یریه اللہ مقعده من الجنة و ھو حی رواہ رزین** (مشکوۃ شریف باب ذکر اللہ عزوجل) غافلوں کے درمیان جو لوگ اللہ کے ذاکر بندے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں زندگی ہی میں جنت کا ٹھکانا دکھادیتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد مظہر صاحب کا واقعہ اس کا ہلکا سا نمونہ ہے۔

ہے، چپراسی کو نہیں، مولانا کے واقفین نے بتایا کہ یہی مولانا عنایت الٰہی صاحب ہیں، جو مظاہر علوم کے مہتمم ہیں، وہ سوچ میں پڑ گیا کہ اتنے بڑے ادارے کو چلانے والا اس قدر سیدھی سادی زندگی بسر کرتا ہے۔

اور ایک مولانا عنایت الٰہی صاحب ہی نہیں، اس وقت تو اجتماع ہی ایسے اللہ والوں کا تھا کہ ہر ایک سادگی و بے نفسی احتیاط وتقوی اور زہد کا مثالی نمونہ تھا، معرفت الٰہی نے خشیت کا وہ رنگ دل میں جما دیا تھا کہ شریعت طبیعت کا تقاضا بن گئی تھی، حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ نے آپ بیتی میں لکھا ہے کہ۔

> مظاہر علوم کا جب سالانہ جلسہ ہوتا تھا، میں نے اکابر مدرسین و ملازمین میں سے کبھی کسی کو جلسہ کے کھانے یا چائے یا پان کو کھاتے نہیں دیکھا، جملہ مدرسین حضرات اپنا اپنا کھانا کھاتے تھے، لیکن حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہٗ کے مکان سے دس بارہ آدمیوں کا کھانا آتا تھا، جو متفرق مہمانوں کے سامنے رکھدیا جاتا، اسی میں سے حضرت نوش فرماتے، مدرسہ کی کوئی چیز کھاتے نہیں دیکھا، مولانا عنایت الٰہی صاحب مہتمم مدرسہ دوشب روز مدرسہ کے اندر رہتے اور ظہر کے وقت یارات کے بارہ بجے اپنے دفتر کے کونے میں بیٹھ کر ٹھنڈا اور معمولی کھانا تنہا کھا لیتے تھے۔

مولانا ظہور الحق صاحب مدرس مدرسہ اس زمانہ میں مطبخ طعام کے منتظم ہوتے تھے اور چوبیس گھنٹہ مطبخ کے اندر رہتے تھے، لیکن سالن چاول وغیرہ کا نمک کسی طالب علم سے چکھواتے تھے خود نہیں چکھتے تھے جب وقت ملتا اپنے گھر جا کر کھانا کھاتے تھے۔ (آپ بیتی ۱/ ۲۹)

اس درجہ احتیاط، اسی کیفیت احسانی کا ثمرہ ہے، جس میں بندہ ہمہ وقت خود کو حق تعالیٰ کی نگرانی میں سمجھتا ہے، یہ کیفیت اس دور میں جس کی بات ہو رہی ہے بہت عام تھی، جو حضرات بزرگی اور تقوی میں متعارف تھے، ان کا تو کہنا ہی کیا، جو عوام میں شمار ہوتے تھے، وہ بھی اسی کیفیت میں سرشار نظر آتے ہیں۔

یہاں لگے ہاتھوں اسی سلسلہ بیان میں حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس

سرہ کے کاتب خاص اور حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے والد گرامی جو خود بھی اعلیٰ پایہ کے محدث اور استاذ تھے، ایک عرصہ تک انھوں نے جامعہ مظاہر علوم میں تدریس حدیث کی خدمت حسبۃً للہ انجام دی ہے، اس احتیاط وتقوی میں ان کا بھی ایک خاص معمول قابل ذکر ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اللہ والوں کی صحبت اور ان کی برکت سے جو کیفیت احسانی انسان کو حاصل ہوتی ہے، وہ کتنے اعلیٰ مدارج اور بلند احوال ومقامات تک سالک کو پہونچا دیتی ہے۔ راوی اس کے بھی وہی حضرت شیخ الحدیث ہیں، جو انھیں صاحب واقعہ حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے نامور اور گرامی قدر فرزند ہیں، اور جو اپنی ذات، اپنے زہد وورع، اپنے علم وفضل اور حسن تربیت میں جامعہ مظاہر علوم کی ایک نمایاں شناخت ہیں، وہ تحریر فرماتے ہیں۔

> ’’میرے والد صاحب قدس سرہ کے زمانے میں مدرسہ کا مطبخ جاری نہیں ہوا تھا، نہ مدرسہ کے قریب کسی طباخ (باورچی) کی دکان تھی، گھر والوں کے نہ ہونے کے زمانے میں جامع مسجد کے قریب ایک طباخ کی دکان تھی جس کا نام اسماعیل تھا، اس کے یہاں سے کھانا آیا کرتا تھا، سردی کے زمانے میں وہاں سے آتے آتے خصوصاً شام کو ٹھنڈا ہوجاتا تھا، تو سالن کے برتن کو مدرسہ کے حمام کے سامنے اندر نہیں بلکہ باہر رکھوادیتے تھے، اس کی تپش سے وہ تھوڑی دیر میں گرم ہوجاتا تھا، تو یہ فرماکر دو تین روپے ہر ماہ چندہ کے اندر داخل فرمایا کرتے تھے کہ مدرسہ کی آگ سے انتفاع ہوا ہے، (یعنی فائدہ اٹھایا گیا ہے) تنخواہ تو میرے والد صاحب قدس سرہ نے اپنے سات سالہ قیام مدرسہ میں کبھی لی ہی نہیں۔ (آپ بیتی ج۱/۳۰)

مہتمم صاحب مولانا عنایت الٰہی صاحب کا حال اوپر گزر چکا ہے، مزید یہ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث قدس سرہ اطلاع دیتے ہیں کہ:

> ’’مدرسہ کے دفتر میں انکے پاس دو قلمدان رہتے تھے، ایک ذاتی اور ایک مدرسہ کا۔ ذاتی قلمدان میں کچھ ذاتی کاغذ رہتے، اپنے گھر کوئی ضروری پرچہ بھیجنا ہوتا

> تو اپنے قلمدان سے لکھتے تھے‘‘ (حوالہ بالا)

عمل کا یہ تقوی، نیت کا یہ خلوص اور نفس کا یہ مجاہدہ جہاں بھی ہوگا، وہ ماحول روشن ہوگا، حق تعالیٰ کی جانب سے قبولیت کا نزول ہوگا۔ ابتدائی دور میں ہمارے دونوں مراکز دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور اس دولت سے مالا مال تھے۔

ہندستان کے مشہور محدث حضرت مولانا احمد علی صاحب سہارنپوری قدس سرہ مظاہر علوم کے ابتدائی سرپرستوں میں تھے، تعمیرات کے سلسلے میں کلکتے تشریف لے گئے، واپسی کے بعد جب آمدنی وخرچ کے حسابات دفتر میں داخل کئے تو ایک خرچ کے متعلق تحریر فرمایا۔

> ’’کلکتہ میں میں فلاں جگہ ایک دوست سے ملنے گیا تھا، اگرچہ وہاں چندہ خوب ہوا لیکن میری نیت دوست سے ملنے کی تھی، چندہ کی نہیں تھی اس لئے وہاں کی آمد ورفت کا کرایہ حساب میں سے وضع کرلیا جائے‘‘۔ (حوالہ بالا ج ۱/ ۲۷)

جس وقت کا ہم ذکر کررہے ہیں، اس دور میں تصوف وسلوک سے بدگمانی عام نہ تھی، گوکہ بعض لوگ اس بزرگ طریقہ کی اپنی غلط حرکات اور بے جارویوں کی وجہ سے بدنامی کا سامان بھی بن رہے تھے، تصوف کے نام پر بہت سی بدعات وخرافات اور رسوم کا رواج ہوچکا تھا، تاہم مصلحین اور مجددین بھی اپنا کام کررہے تھے، غلط اور صحیح کے درمیان خط امتیاز کھینچ رہے تھے، مقاصد اور وسائل کو ان کے درجے میں رکھ رہے تھے، اور انھیں خوب احساس تھا کہ اصل تصوف میں بہت کچھ ملاوٹ ہوچکی ہے، اسی لئے یہ حضرات پوری کوشش کررہے تھے کہ ملاوٹ کے اجزاء حذف کردئے جائیں اور جو واقعی اجزاء ہیں انھیں باقی رکھا جائے، کیونکہ تصوف وسلوک کے طریق سے قلب اور نفس کا جو تزکیہ اور اس کی اصلاح ہوتی ہے، اس کا متبادل کوئی اور امر نظر نہیں آتا، اور محققین صوفیہ سے جو نفع دین کو پہونچتا ہے، وہ مخفی نہیں ہے، اس لئے اصل تصوف کو چھوڑا نہیں جاسکتا، البتہ ملاوٹ کی اصلاح ضروری ہے اور یہ بات مصلحین صوفیہ کی نگاہ میں ہمیشہ رہی، ہمارے وہ علماء ومشائخ جو دیوبند اور سہارنپور کے کاروان ایمان وعزیمت کے قافلہ سالار رہے ہیں، وہ علم وفضل کے ساتھ تصوف وسلوک

کے باب میں مجتہدانہ شان رکھتے تھے، انھوں نے اس طریق کو بدعات کی آمیزش سے پاک کیا، اور اس سے دین وشریعت کی بڑی خدمت لی۔

اس گروہ کے قافلہ سالاروں میں ایک بہت عظیم شخصیت حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہ کی ہے، جو علم حدیث وفقہ میں امامت کا درجہ رکھتے ہیں، اور ساتھ میں احسان وسلوک میں بھی ان کی شان امامت مسلم ہے، علم ظاہر میں بھی اور روحانیت میں بھی ان سے بہت فیض پہونچا۔ حضرت گنگوہی دیوبند اور سہارنپور دونوں جگہوں کے سرپرست اور شیخ تھے، یہاں ان کی ایک تقریر نقل کررہا ہوں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ حضرات کتنی گہری نگاہ رکھتے تھے، اور ان میں کتنا انصاف تھا، اور ساتھ ہی اصلاح کا کیسا زبردست داعیہ تھا، یہ تقریر علمائے دیوبند کے مشہور راوی حضرت حاجی امیر شاہ خاں نے نقل کی ہے، جو اپنی قوت حفظ اور امانت ودیانت میں معروف تھے، اور اکابر علماء کے یہاں ان کا بڑا اعتبار تھا، حاجی امیر شاہ خاں صاحب نقل کرتے ہیں۔

> ’’حضرت نے فرمایا میاں امیر شاہ خاں ابتداء سے اس وقت تک جس قدر ضرر دین کو صوفیہ(۱) سے پہونچا اتنا کسی اور فرقہ سے نہیں پہونچا، ان سے روایت کے ذریعے بھی دین کو ضرر ہوا، اور عقائد کے لحاظ سے بھی اور اعمال کے لحاظ سے بھی، اور خیالات کے لحاظ سے بھی، اس کے بعد اسکی قدرے تفصیل فرمائی اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت روحانی کی یہ حالت تھی کہ بڑے سے بڑے کافر کو **لا الہ الا اللہ** کہتے ہی مرتبۂ احسان حاصل ہوجاتا تھا، جس کی ایک نظیر یہ ہے کہ صحابہ نے عرض کیا ہم پاخانہ پیشاب وغیرہ کیسے کریں اور حق تعالیٰ کے سامنے ننگے کیونکر ہوں یہ انتہا ہے، کہ ان کو مجاہدات وریاضات کی حاجت نہ ہوتی تھی، یہ قوت بفیض نبوی صحابہ میں

---

(۱) اس پر حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہ حاشیہ تحریر فرماتے ہیں کہ مراد وہ لوگ ہیں جو صرف صوفی ہیں اور علوم دینیہ سے تحقیقاً یا تقلیداً اور اتباع محققین سے عاری ہیں، ورنہ صوفیہ جامعین سے تو بے حد نفع دین کو پہونچا ہے، چنانچہ قریب ہی آئندہ سطور میں ان کی شان اصلاح اسی حکایت میں مذکور ہے۔

بھی تھی، مگر جناب رسول اللہ صلی اللہ وسلم سے کم اور تابعین میں بھی تھی، مگر صحابہ سے کم لیکن تبع تابعین میں یہ قوت بہت کم ہوگئی تھی، اس کمی کی تلافی کیلئے بزرگوں نے مجاہدات اور ریاضات ایجاد کئے، ایک زمانہ تک یہ محض وسائل غیر مقصود کے درجے میں رہے، مگر جوں جوں خیر القرون کو بعد ہوتا گیا۔ ان میں مقصودیت کی شان پیدا ہوتی رہی، اور وقتاً فوقتاً ان میں اضافہ بھی ہوتا رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین میں بے حد بدعات علمی و عملی و اعتقادی داخل ہوگئیں، محققین صوفیہ نے ان خرابیوں کی اصلاحیں بھی کیں، مگر اس کا نتیجہ صرف اتنا ہوا کہ ان بدعات میں کچھ کمی ہوگئی، مگر بالکل ازالہ نہ ہوا، حضرت نے مصلحین میں شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ شہاب الدین سہروردی، مجدد الف ثانی اور سید احمد صاحب قدست اسرارھم کے نام خصوصیت سے لئے، اور فرمایا کہ ان حضرات نے بہت اصلاحیں کیں، مگر خاطر خواہ فائدہ نہ ہوا، نیز یہ بھی فرمایا کہ ان حضرات پر حق تعالیٰ نے طریق سنت منکشف فرمایا تھا، اور الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بھی وہی طریق منکشف فرمایا ہے، پھر فرمایا کہ طریق سنت میں یہ بڑی برکت ہے کہ شیطان کو اس میں رہزنی کا موقع بہت کم ملتا ہے، چنانچہ ایک کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جن امور کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام فرمایا ہے، جیسے نماز باجماعت وغیرہ اگر کوئی سختی سے ان کی پابندی کرے اور فرائض وواجبات اور سنن مؤکدہ کا پورا اہتمام کرے تو نہ خود اس کو وسوسہ آتا ہے کہ میں کامل بزرگ ہوگیا ہوں اور نہ دوسرے اسے ولی اور بزرگ سمجھتے ہیں، لیکن اگر کوئی ان امور کا اہتمام کرے جن کا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہتمام نہیں فرمایا مثلاً چاشت، اشراق، صلوۃ اوابین، وغیرہ کا پابند ہو، تو وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ اب میں بزرگ ہوگیا، اور دوسرے بھی سمجھتے ہیں کہ اب یہ بزرگ ہوگیا۔

اسی تقریر کے دوران حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ شارع علیہ السلام نے احسان کو مطلوب قرار دیا تھا، مگر صوفیہ نے بجائے اس کے استغراق کو مقصود بنایا۔ (ارواح ثلاثہ/ ۳۹۷)

حضرت گنگوہی کی اس اجمالی تقریر کی وضاحت تو مستقل تصنیف چاہتی ہے، یہاں عرض کرنا یہ ہے کہ تصوف کے نام پر جو رسوم جاری ہیں، ان کی حقیقت تو کچھ نہیں لیکن اصل میں تصوف جس کی حقیقت تصحیح نیت ہے، اور جس کا مقصود ومنتہا احسان ہے وہ بہت ضروری ہے، اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ وہی قلبی ونفسی ریاضات ومجاہدات اوراذ کار واشغال ہیں، جن کے ذریعے ایک امت کی امت نسبت احسان سے مالا مال ہوئی ہے، ان ریاضات ومجاہدات اوراذ کار واشغال کے مخصوص طریقے مقصود نہیں ہیں۔ ان کے بغیر ہی اگر کسی کو کیفیت احسان حاصل ہو جاتے ہیں تو چشم مارا روشن ودل ماشاد۔

لیکن ایسا ہوتا نہیں، نسبت باطنی اور دولت احسان کا جو سرمایہ کسی کو ملا ہے عموماً اسی طریق سے ملا ہے، اس لئے اس سے روگردانی کرنا بڑی محرومی کی بات ہے۔

معلوم ہے کہ جس دور میں ہندوستان کے اندر مدارس کا ایک نیا دور اور نیا طور شروع ہو رہا تھا، اور اس نئے عہد کی بنیاد دارالعلوم دیوبند اور مظاہر علوم سہارنپور سے پڑ رہی تھی، اس کے تھوڑے دنوں پہلے اس ملک میں جو برائے نام سہی مسلمانوں کی سلطنت مغلوں کے آخری چشم وچراغ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے وجود سے باقی تھی، اس نے بھی ۱۸۵۷ء کے بعد دم توڑ دیا تھا، اب پورے ملک پر انگریزوں کی حکومت کا پرچم لہرا رہا تھا، مسلمانوں میں افسردگی، بے دلی، مایوسی کی کیفیات پھیلی ہوئی تھیں، ایسے وقت میں ضرورت تھی کہ دلوں کو ایمان کی حرارت سے گرمایا جائے، اعمال صالحہ کی روح پھونکی جائے، علم دین کی طرف بے تابانہ شوق پیدا کیا جائے، تو اللہ تعالیٰ نے ایسے بزرگوں کو کھڑا کیا، جن کے قلوب محبت الٰہی کی دہکتی ہوئی انگیٹھیاں تھے، جن کے چہرے نور ایمانی سے تابناک تھے، جو علوم شریعت کے خزینہ دار تھے، اور سنت باطنی کی حلاوت سے سرشار تھے، اس وقت ہندوستان میں جا بجا ایسے بزرگوں کے دم قدم سے علم ومعرفت کی روشنی پھیل رہی تھی، اگر میں اس دور کے ان بزرگوں کی فہرست تیار کروں اور مختصر مختصر سا بھی ان کا تعارف کراؤں تو بھی یہ مقالہ کتاب بن جائے گا۔

مختصر یہ کہ فیض سب سے پہونچا، اور سب نے ایک ایک علاقہ میں بحکم الٰہی، دین و

ایمان کو سنبھالا لیکن وہ حضرات جو اس موضوع پر بہت زیادہ بافیض ہوئے، اور جن کے انفاس قدسیہ سے اللہ تعالیٰ نے بلا تخصیص علاقہ اور خطہ فائدہ پہونچایا، اور جن کی قوت نسبت نے پورے ملک کو سنبھالا، یہ حضرات علماء دیوبند اور علماء سہارنپور تھے، یہ بزرگوار جہاں تحصیل علم کے لئے خون جگر جلا رہے تھے، اس نسبت باطنی کی تحصیل وتکمیل کے لئے بھی مجاہدات وریاضات کی بھٹی میں خود کو تپا رہے تھے، اس عہد میں ان دونوں مدارس میں اور پھر ان مدارس میں جن کا تعلق ان دونوں سے تھا، اصحاب علم کے ساتھ اصحاب نسبت کا مجمع تھا، اساتذہ وملازمین تمامتر کسی نہ کسی بزرگ کے دامن فیض سے وابستہ ہوتے تھے، اس کا اثر یہ ہوتا تھا کہ طلبہ میں بھی دینداری عام تھی، تقوی سے آراستہ تھے، اور کتنے تو فراغت تک پہونچتے پہونچتے صاحب نسبت ہوجاتے تھے۔

آغاز کار میں ان دونوں مدرسوں کے ارباب درس وانتظام گنگوہ کی خانقاہ سے وابستہ تھے، دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث اور صدر الاساتذہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی اور جامعہ مظاہر علوم کے شیخ الحدیث اور صدر الاساتذہ حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری، دونوں حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کے خاص مسترشد اور خلیفہ تھے۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب نے کچھ دن دارالعلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی پھر مظاہر علوم پہنچے اور وہیں تعلیم کی تکمیل کی، تکمیل کے بعد چندے کہیں کہیں درس وتدریس میں رہے، پھر مظاہر علوم آگئے تو یہیں کے ہوکر رہ گئے، یہاں سے اٹھے تو سرزمین مقدس مدینہ طیبہ زادھا اللہ شرفا واجلالا میں حاضری دی، اور وہاں سے سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔

۱۲۸۸ھ میں جامعہ مظاہر علوم سہارنپور سے حضرت مولانا کی فراغت ہوئی، فارغ ہونے کے بعد جیسا کہ اس دور میں عام دستور تھا، آپ کو مرشد کی تلاش ہوئی وہاں تلاش کیا کرنا تھا پاس ہی میں گنگوہ کے اندر محبت ومعرفت کا ایک سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، اور پیاسے ہر طرف سے پروانہ وار آرہے تھے، مولانا بھی وہیں پہنچ گئے اور حضرت مولانا رشید احمد صاحب محدث گنگوہی کے دامن فیض سے وابستہ ہوگئے، تدریس کا کام بھی جاری رہا اور

تصوف وسلوک کے مجاہدات بھی کرتے رہے۔

شیخ کی محبت وعقیدت میں سرشار ہوکر حضرت مولانا نے سلوک وطریقت کی بادیہ پیمائی شروع کی، تو تھوڑی ہی مدت میں کیفیت کمال پیدا ہوگئی، ۱۲۹۷ھ میں حضرت مولانا حج کے لئے جانے لگے تو حضرت گنگوہی قدس سرہ نے اپنے شیخ ارشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہ کی خدمت میں عریضہ تحریر فرمایا:

’’مولوی خلیل احمد حاضر خدمت ہوتے ہیں، حضرت ان کی حالت پر مطلع ہوکر مسرور ہوں گے‘‘۔

حضرت مولانا جب حضرت حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور یہ عریضہ پیش کیا نیز حضرت حاجی صاحب نے مولانا کی باطنی کیفیات کا مشاہدہ فرمایا تو واپسی میں اپنی دستار مبارک اپنے سر سے اتار کر مولانا کے سر پر رکھی اور بیعت کی اجازت دی، اور خلافت نامہ تحریر فرما کر دیا۔ (تذکرۃ الخلیل/۷۴)

حضرت مولانا کو اپنے شیخ سے کمال درجہ کی مناسبت اور محبت وعقیدت تھی، ایک مرتبہ مولانا نے ایک خواب حضرت گنگوہی کی خدمت میں بیان کیا، تو حضرت مسکرائے اور فرمایا کہ:

تم خود سمجھتے ہوگے، آخر نسبت تو ایک ہی ہے۔ (حوالۂ سابق/۷۷)

ایک بار کسی تذکرہ میں حضرت گنگوہی نے فرمایا:

جو میں، وہی مولوی خلیل احمد (حوالۂ سابق/۷۷)

ایک مکتوب میں حضرت گنگوہی نے لکھا کہ:

آپ کی نسبت کو جس قدر اس عاجز سے مناسبت ہے .... کو اس قدر مناسبت نہیں ہے۔ (مکاتیب رشیدیہ/٦٩)

حضرت مولانا کی نسبت باطنی کس پایہ کی تھی، اس کا کچھ اندازہ ان کے شیخ ومرشد حضرت مولانا گنگوہی قدس سرہ کے ایک مکتوب مبارک سے ہوتا ہے، اس کو ہم یہاں بتمام وکمال نقل کرتے ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سالک جب اس راہ میں قدم اٹھاتا ہے تو اس

کو کیسی بڑی بڑی نعمتیں حاصل ہوتی ہیں، آج کی مادی دنیا میں یہ باتیں خواب وخیال محسوس ہوتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ یہی اصل حقیقت ہے، اور باقی خواب وخیال۔

یہ مکتوب مبارک حضرت مولانا خلیل احمد صاحب علیہ الرحمہ کے کسی عریضے کے جواب میں ہے، وہ عریضہ تو سامنے نہیں ہے، لیکن حضرت گنگوہی کی تحریر سے اس عریضے کا اندازہ لگانا دشوار نہیں ہے۔

> مولوی خلیل احمد صاحب   السلام علیکم! آپ کا خط آیا، حضور مسمی (۱) اور اس کے شکر کے عجز سے بہت بہت فرحت ہوئی، **الحمدللہ علی ذٰلک**، آدمی کا اگر ہر بن مو، ہزار ہا ہزار ہا زبان ہو جائے اور مدت دنیا ایک ادنی نعمت کا شکر ادا کرنا چاہے نہیں ہوسکتا، بلکہ ہر قصد شکر بھی ایک نعمت عظمی ہے، دوبالا مرہون ومنن کبری ہوتا جاتا ہے، وہ کون ہے کہ توفیق حضور کا شکر تلقین کر سکے، ہاں عجز عن اداء شکر کو اگر بجائے شکر قبول فرما لیویں تو بندہ نوازی سے کیا بعید ہے کہ ایسے نالائق بے بس کو ایسے منعم حمہ سے معاملہ ہوا، (۲) بجز ایں کہ ہمہ تن فنا اپنے کردار سے ہوکر پانی ہوجائے، اور شرم اپنے قصور اور اس کے نعماء سے خاک بن جاوے، اور کیا کرسکتا ہے؟ بارے شکر ہے کہ آپ کو یہ مقام عطا ہوا، اس کا نام "یادداشت" باصطلاح حضرات نقشبندیہ ہے، اب اس یادداشت کے ساتھ جیسا مالک حقیقی کی ہونی ضرور ہے، کہ جیسا ہم اپنے کسی بڑے مربی منعم ذی جاہ کے سامنے کوئی سبک حرکتی، خلاف رضا نہیں کر سکتے، ایسا ہی معاملہ خلوت میں اپنے اس حاضر وناظر مولی سے ہونا چاہئے، تاکہ حضور مسمی کا مصداق پورا ہوجائے، کہ اپنی ہر ہر حرکت کو پیش نظر اس مالک تعالیٰ شانہ جان کر بمیزان شرع کہ قانون رضا ہے، ناپ تول کر دھیان رہے، اب یہ مراقبہ دائمی کرنا چاہئے۔
>
> الغرض ہر کام کو بحضور ذات تصور کرنا، اور اس کا مرضی وغیر مرضی دریافت کر کے ترک وعمل کرنا چاہئے، اور اس کا ہی نام "احسان" ہے، **وفقنا اللہ** (انتہی)

---

(۱) حضور مسمی کا مطلب یہ ہے کہ ذات پاک حق کا استحضار قائم ہوجائے، اور اس کی یاد دل میں دائم ہوجائے۔

(۲) یعنی شکر نعمت کا قصد وارادہ بھی کرے، توبہ کا قصد ہوجانا بھی اللہ کا ایک بڑا احسان ہے، اس طرح انسان مزید احسان مند ہوجاتا ہے، پھر کہاں تک شکر ادا کرے، ہاں اس عجز کو ہی بجائے شکر قبول کرلیں، تو بندہ نوازی ہے۔

(تذکرۃ الخلیل/ ۸۹)

ایک اور مکتوب گرامی میں ذکر اور یادداشت یعنی کیفیت احسان کی تشریح فرماتے ہیں، اصل مکتوب فارسی میں ہے، ہم اس کا حاصل مطلب لکھتے ہیں:

> مکرما! ذکر کی اصل یادداشت ہے، یادداشت کا مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کی یاد بغیر کسی حرف اور آواز کے دل میں بیٹھ جائے، جیسے کوئی دوست اپنے دوست کو اس کی عدم موجودگی میں اپنے دل کے اندر پاتا ہے، انسان کی اصل فطرت میں مالک حقیقی جل شانہٗ جو واقعی محبوب ہیں، ان کی یاد دل میں جمادی گئی ہے، مگر اس دنیا میں آ کر دنیا کی چیزوں میں مشغول ہو گیا، اور محبوب حقیقی کو بھول بیٹھا، مشائخ نے اسی یاد کو تازہ کرنے کیلئے تدبیریں اختیار کیں، کبھی ذکر لسانی تلقین کیا، کبھی لطائف میں ذکر کی حرکت پیدا کرتے ہیں، مقصود وہی یادداشت ہے کہ ان تدبیروں سے وہ حاصل ہو جائے (تذکرۃ الخلیل ۹۰)

ایک اور مکتوب حضرت گنگوہی کا قابل ملاحظہ ہے، اس سے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کی استعداد عالی کا پتہ چلتا ہے، اور اس سے ان کی نسبت مع اللہ کا بھی اندازہ ہوتا ہے، جو ایک انسان کا سب سے بیش قیمت سرمایہ ہے۔ حضرت اقدس مولانا گنگوہی قدس سرہٗ تحریر فرماتے ہیں:

> عزیزم! اولاً تو بغور سنو کہ مقصد جملہ اشغالات و مطلب ومنتہا جملہ مراقبات کا وہ حضور قلب بے کیف ہے کہ حق تعالیٰ نے آپ کو نصیب فرمایا، نسبت صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہ ہی حضور تھا، نہ وہاں نور تھا، نہ اضمحلال اشیاء کسی نور میں تھا، نہ وجود کی تحقیق نہ شہود کی تدقیق نہ فرق[1] (نہ جمع) دونوں حالت میں نہ کرامت نہ انکشاف، نہ اپنا ارتباط تجلی کے ساتھ کسی کو ظلی یا عینی واضح ہوا، نہ مراتب کو ان کو ادراک کیا، محض عبادت تھی، عینیت[2] یا غیریت خود و فرق عابد و معبود، تنزیہ، تمام کی حالت میں

---

[1] مطبوعہ مکاتیب میں ''نہ جمع'' کا لفظ نہیں ہے، لیکن عبارت کا تقاضا ہے کہ ہو، کیونکہ فرق کے بالمقابل جمع کی اصطلاح ہے۔ [2] یہاں عینیت کے بجائے مطبوعہ مکاتیب میں عبادت کا لفظ ہے مگر وہ کاتب کی غلطی ہے غیریت کے مقابلے میں عینیت ہے

> کرتے تھے، ہاں حب اللہ تعالیٰ کا غلبہ تھا کہ جان و مال کو اس کی جنت (یعنی مقابلے) میں کچھ اصل نہ جانتے تھے، ہزار جان و ساری دنیا کے عوض رضائے نائب الٰہی کو مقدم پہچانتے تھے، اور اس حالت کے عطیہ کو کونین سے بہتر سمجھتے تھے طمع جنت الٰہی و خوف نار غضب انکا شعار تھا، یہ نسبت یادداشت و احسان تھی کہ شمہ اس کا میرے سعید ازلی قرۃ العینین خلیل احمد کو نصیب ہوئی، جس پہ ہزار فخر و ناز یہ بندہ ناساز کر کے اپنا وسیلہ قرار دئے مطمئن بیٹھا ہے، اگرچہ خود اس دولت سے محروم رہا، مگر ناودان اپنے دوستوں کا بنا۔ (مکاتیب رشیدیہ ۶۷)

حضرت اقدس مولانا رشید احمد گنگوہی جیسے صاحب نظر اور محقق عالم و شیخ نے حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کو جس نسبت کے حصول کی بشارت دی ہے، حضرت نے بتایا کہ یہی نسبت صحابۂ کرام کی ہے، جس کا ایک حصہ مولانا کو نصیب ہوا، حضرت گنگوہی کے ان مکاتیب کو بار بار پڑھنا چاہئے، موجودہ دور دنیا پرستی میں یہ باتیں اجنبی معلوم ہوتی ہیں، آج صرف بدن اور بدن کے تقاضے اور خواہشیں زندہ ہیں روحانیت اور روحانیت کے تقاضوں سے عام انسان تو الگ رہے، جن کے گھر کی یہ دولت ہے یعنی اہل اسلام، وہ بھی ان باتوں سے آنکھیں موندرہے ہیں، بلکہ کتنے ہیں جو مخالفت پر آمادہ ہیں۔

یا للعجب اگر مخالفت کر کے اسی روحانی دولت کو کھودیں گے، تو پھر کون سرمایہ ان کے پاس ہوگا جسے یہ لے کر خداوند تعالیٰ کے حضور حاضر ہوں گے۔

یہ نسبت مع اللہ، یہ کیفیت یادداشت، یہ ملکۂ احسان، یہی عبادت کی بلکہ زندگی کی روح ہے یہی نہ ہو تو ڈھانچہ ہے روح سے خالی! بھلا اس میں کتنا دم ہوگا۔

حضرت مولانا سہارنپوری کو جب اس نسبت میں رسوخ حاصل ہوا، تو پھر ان کا حال یہ ہوا۔

آہن کہ بپارس آشنا شد　　　آہن نماندفی الفور طلا شد
لوہا جو پارس سے آشنا ہوا　　　لوہا نہیں رہا، دفعۃً سونا ہوگیا

مولانا کی صحبت میں خلوص و عقیدت سے جو آیا، وہ کچھ سے کچھ ہوگیا، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں حافظ شیرازی نے کہا ہے۔

آنانکہ خاک را بنظر کیمیا کنند   آیا بود کہ گوشۂ چشمے بما کنند

وہ لوگ جو نگاہ سے مٹی کو سونا بنا دیتے ہیں، کیا ایسا ہوگا کہ ہماری طرف بھی گوشۂ چشم سے التفات فرمادیں۔

حضرت مولانا کا تعلق ۱۳۱۴ھ سے تادم وفات ۱۳۴۶ھ ۳۲/ سال تک جامعہ مظاہر علوم سے رہا، اس عرصہ میں حضرت مولانا کی نگاہ کیمیا ساز نے جامعہ مظاہر علوم کو نسبت باطنی کے مقدس اور بابرکت رنگ میں پختہ کردیا، اللہ ہی جانتا ہے کہ نگاہوں کے التفات نے کتنے قلوب کی دنیا بدل دی ہوگی، حضرت مولانا کی خدمت وصحبت میں جو لوگ نسبت باطنی کے انوار سے روشن ہوئے ان کی تعداد بہت ہے، لیکن ان میں دو بزرگ ایسے ہیں، جنھیں اگر امت کہا جائے تو بجا ہے، ان دونوں بزرگوں سے ہدایت، تعلق مع اللہ، فکر آخرت اور علم وعمل کی جو بہار دنیا میں آئی ہے، وہ حضرت مولانا کی روحانیت اور عرفانی شان کی کرامت ہے۔

ان دو میں ایک بزرگ حضرت مولانا محمد الیاس صاحب قدس سرہٗ ہیں، جنھوں نے مسلمانوں میں ایمان وعمل کی وہ روح بیدار کی کہ آج پورا عالم اسلام اس روح سے زندگی پا رہا ہے، تبلیغی جماعت، جواب ایک عالمی جماعت بن چکی ہے، اور جس کے فیض سے ایک دنیا کی دنیا خواب غفلت سے چونکی ہے، اور چونک کر دین وایمان کی طرف پلٹی ہے، اس کی داغ بیل حضرت مولانا محمد الیاس صاحب ہی کے ہاتھوں پڑی ہے۔

دوسرے بزرگ شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ ہیں جنھوں نے تمام زندگی جامعہ مظاہر علوم میں بسر کی، اور سفر آخرت کا رخت سفر باندھنا ہوا، تو اپنے شیخ کی تقلید واتباع میں سہارنپور سے اٹھے اور جوار رسول میں پہونچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں جان عزیز نچھاور کی۔ **رحمہ اللہ**

حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ علم اور روحانیت دونوں کے بحر ذخار تھے، اللہ نے ان کے وقت میں، ان کی نیت میں، ان کے کاموں میں بہت برکت دی تھی، علم حدیث پر ایسی کتابیں تصنیف کیں، کہ وہ قدمائے محدثین کی صف میں جا شامل ہوئے۔ جامعہ مظاہر

علوم میں مدرس ہوئے تو پرانے مدرسین کی یادتازہ کردی، بیعت وارشاد اورتربیت باطنی کی طرف متوجہ ہوئے تو حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، حضرت نظام الدین محبوب الٰہی وغیرہ علیہم الرحمۃ والرضوان کے کارنامے جھلکنے لگے۔ ان کی وہ کتابیں جوعوام کے لئے عام فہم زبان لکھی گئیں، فضائل نماز، فضائل رمضان، فضائل تبلیغ، فضائل صدقات، فضائل حج، فضائل درود، حکایات صحابہ، یہ اتنی پڑھی گئیں کہ اردو میں کم کتابیں اتنی پڑھی گئی ہوں گی۔

حضرت شیخ پر اس مضمون میں اس سے زیادہ لکھنے کی جرأت میں اپنے اندر نہیں پاتا۔ ان کی صرف احسانی اور روحانی زندگی، اور اس کے احوال لکھنے کے لئے دفتر درکار ہیں۔

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کے حسنات میں اور کچھ نہ ہوتا یہی دو بزرگ ہوتے، تو ان کی عظمت وجلالت کیلئے بہت کافی تھے۔

یہ جو کچھ لکھا گیا حضرت مولانا کی نسبت باطنی کے اثرات وتجلیات ہیں، اس کے جلوے زندگی کے تمام احوال ومقامات میں ظاہر ہوتے ہیں۔ احسانی کیفیت کا سب سے نمایاں اثر آدمی کی عبادتوں، بالخصوص نماز میں ظاہر ہوتا ہے۔

حضرت مولانا کے خاص اہل تعلق میں ایک بڑے زیرک، جہاں دیدہ، وکیل مولوی عبداللہ جان صاحب تھے، مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی نے ان کے حوالے سے لکھا ہے کہ:

> ''ایک خاص واقعہ جو میں نے حضرت کے متعلق ہمیشہ نوٹ کیا اور وہ میرے دل پر نہایت مؤثر رہا ہے، یہ ہے کہ ادائے نماز کی حالت میں بمصداق ''کانک تراہ'' (گویا تم اللہ کو دیکھ رہے ہو) حضرت پر وقار اور خشوع وسکینہ کی ایک خاص حالت طاری رہتی تھی، بحمد اللہ بچپن سے میری تعلیم وتربیت اور نشست وبرخواست علماء کرام کی صحبت میں رہی ہے، مگر حضرت کے سوا میرے ذہن میں اور کوئی مثال نہیں ہے جس کو حضرت کی نماز کے مماثل کہہ سکوں، بدن میں کھجلی لگے، تو ہر شخص کو کھجاتے دیکھا ہے، مگر حضرت کو یوں معلوم ہوتا کہ نماز کی حالت میں کوئی خارجی ضرورت ہی

> پیش نہیں آتی، بلکہ میں نے تو یہ بھی دیکھا ہے کہ کبھی حضرت کو زکام یا کھانسی کی شدت ہوئی، تو نماز کے شروع کر دینے کے بعد ختم نماز تک حضرت کو کبھی کھانسی نہیں آئی۔
>
> آپ کی نماز دیکھ کر کفار کو بھی احساس ہوتا تھا کہ خدا کے سامنے ایسے کھڑا ہونا چاہئے، ایک بار آپ سفر میں کسی اسٹیشن پر تھے، ظہر کی نماز جماعت سے ادا کی گئی آپ نے ظہر کی سنتیں نہایت اطمینان وخشوع سے پڑھیں، ابتدا کی بھی سنتیں اور بعد کی بھی سنتیں، چند انگریز نماز کا یہ منظر دیکھ رہے تھے، لوگ سنتوں سے فارغ ہوئے مولانا ابھی مشغول تھے، ایک انگریز نے رفقاء میں سے ایک صاحب سے پوچھا کہ تم کس کی نماز پڑھ رہے تھے؟ کہا خدا کی نماز پڑھتے تھے، اس نے حضرت کی طرف اشارہ کر کے پوچھا اور یہ کس کی نماز پڑھ رہے ہیں؟ کہا یہ بھی خدا کی نماز پڑھتے ہیں، تو وہ انگریز بے ساختہ بولا ہاں یہ پادری بے شک خدا کی نماز پڑھتا ہے، مگر تم خدا کی نماز نہیں پڑھتے، معلوم نہیں کس کی پڑھتے ہو، ((تذکرۃ الخلیل: ۳۱۳/۳۱۴)
>
> ایک بار آپ نے خود فرمایا کہ نماز پڑھتے ہوئے نہ مجھے شور وغل پر التفات ہوتا ہے، نہ گانے بجانے پر، البتہ کوئی قرآن پڑھنے لگے تو منازعت (کشمکش) ہونے لگتی ہے، اور اس طرف التفات میں مضطر ہو جاتا ہوں۔ (ایضا)

حضرت مولانا خلیل احمد صاحب قدس سرہ کے ساتھ ایک اور زبردست صاحب نسبت اور بابرکت بزرگ کا ذکر ضروری ہے، جو مظاہر علوم کے ابتدائی دور کے فارغین میں ہیں، یہ ہیں حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب رائے پوری قدس سرہٗ، شاہ صاحب اصلاً پنجاب کے رہنے والے ہیں، مگر ضلع سہارنپور میں رائے پور کے اندر اپنا مستقر بنالیا تھا۔ اسی نسبت سے رائپوری معروف ہوئے، حضرت شاہ صاحب نے تعلیم کی تکمیل جامعہ مظاہر علوم میں ۱۲۹۱ھ میں کی، اساتذہ میں حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری، حضرت مولانا محمد مظہر نانوتوی، حضرت مولانا احمد حسن کانپوری خلیفہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی تھے۔

حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب ابتداءً حضرت شاہ عبدالرحیم (حضرت شاہ عبدالرحیم

صاحب سہارنپوری قدس سرہٗ کے تعارف کیلئے مضمون کے آخر میں ضمیمہ (ا) ملاحظہ فرمائیے) سہارنپوری نوراللہ مرقدہٗ سے بیعت ہوئے تھے، وہاں سے اجازت وخلافت حاصل ہوئی پھر ایک اشارہٗ غیبی سے حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی قدس سرہٗ کی خدمت میں حاضر ہوئے، وہاں بھی بیعت وخلافت سے نوازے گئے۔

حضرت شاہ صاحب نہایت اعلیٰ درجے کے صاحب نسبت اور صاحب کشف وکرامت بزرگ تھے، آپ سے نسبت مع اللہ اور روحانیت کا فیضان عام ہوا، پھر ان کے جانشین اور خلیفہ حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائپوری قدس سرہ سے یہ سلسلہ بہت وسعت کے ساتھ پھیلا، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب نے بھی جامعہ مظاہر علوم سے فیض پایا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کا اور ان کے فیوض و برکات کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے، مگر اس مقالہ میں اس کی گنجائش نہیں، حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الخلیل میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب قدس سرہٗ کی عظمت ورفعت اور قوت نسبت اور آپ کے اخلاق حمیدہ کا قدرے مفصل تذکرہ کیا ہے، وہ ملاحظہ کے قابل ہے، اور حضرت شاہ عبدالقادر صاحب قدس سرہ کا تذکرہ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سوانح حضرت شاہ عبدالقادر رائپوری کے نام سے تحریر کیا ہے، بڑی مؤثر اور دل آویز کتاب ہے، اس خاکسار نے اسے کم از کم بیس پچیس مرتبہ بالاستیعاب پڑھا ہے اور ہمیشہ اس سے ذوق وشوق اور تلاوت قرآن کے داعیے میں اضافہ محسوس کیا، حضرت شاہ صاحب قدس سرہٗ کی روحانیت اس کتاب میں جلوہ گر ہے۔

ہر ماحول اور ہر جگہ پر وہاں کے سرپرست اور بڑے کا اثر چھایا ہوا ہوتا ہے، آپ پڑھ چکے ہیں کہ جامعہ مظاہر علوم کی خشت اول جن لوگوں کے ہاتھوں رکھی گئی، وہ اہل اللہ اور صاحب نسبت مشائخ کے دامن فیض سے وابستہ اور بیعت وارادت کی راہ سے ان کے دست گرفتہ رہے ہیں، نیکی، سادگی، بے نفسی، اللہ کے لئے مرنا جینا، اور اللہ ہی کے لئے زندگی کا ہر لمحہ گزارنا ان کا شعار رہا ہے، گلستان کی اس بہار کا تسلسل حضرت مولانا خلیل احمد

صاحب نور اللہ مرقدہٗ کے طویل دور سرپرستی میں اپنے شباب پر تھا، اس دور میں جو طالب علم آتا چمن کی بہار آفرینیوں میں مست و سرشار ہو جاتا۔

عہد خلیلی میں جہاں بہت سے اصحاب استعداد نے اس جامعہ میں بسیرا کیا اور صاحب فضل و کمال بن کر نکلے، وہیں ایک صاحب صوبۂ پنجاب کے اس علاقے کے باشندے جو صوبہ سرحد کی حدود سے متصل ہے اپنے وطن سے چل کر ۱۳۳۰ھ میں دورۂ حدیث میں داخلہ کی غرض سے مظاہر میں پہونچے، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب کا دریائے علم پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری تھا، داخلہ ہوا، اور جب امتحان سالانہ دیا تو اول درجہ میں کامیاب ہوئے، یہ صاحب جہاں علم کی استعداد کامل رکھتے تھے، وہیں سلوک واحسان کی استعداد سے بھی بہرۂ وافر رکھتے تھے، مظاہر سے فراغت کے بعد دارالعلوم دیوبند جانا چاہا، استاذ نے بخوشی اجازت دی، مگر شرط یہ رکھی کہ تدریس کی خدمت مظاہر کے حق میں محفوظ رہے۔

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی میں انھوں نے حضرت مولانا خلیل احمد کی خدمت میں بیعت کی درخواست کی جو بفضلہٖ قبول ہوئی اور وہ سلسلۂ تصوف میں باقاعدہ داخل ہوگئے، دیوبند سے فراغت کے بعد مظاہر علوم میں بلالئے گئے، اور پھر ایک مختصر سے وقفہ کا استثنا کر کے مسلسل ملک کے آزاد ہونے اور تقسیم ہونے تک یہیں رہے۔

یہ صاحب ہیں حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری رحمۃ اللہ علیہ! ان کی تدریس کی ابتداء میں زیادہ تر توجہ کتابوں کے مطالعے، درس وتدریس میں رسوخ ومہارت اور علم کی توسیع واشاعت کی جانب رہی، اور چونکہ شیخ کی صحبت مسلسل نصیب رہی، اس لئے اس مشغولیت کے باوجود جذبات روحانیت کا اکتساب بہ فیض صحبت ومعیت ہوتا رہا۔ اور تزکیۂ نفس کا عمل کچھ ارادی اور کچھ غیر ارادی طور پر چلتا رہا، یہاں تک کہ شیخ نے ۱۳۴۴ھ میں مدینہ طیبہ کی جانب ہجرت فرمائی، اور اپنی جگہ یہ صدارت تدریس مولانا عبدالرحمٰن صاحب کے سپرد کی۔

۱۳۴۶ھ میں مدینہ طیبہ کی مقدس سرزمین میں شیخ کا وصال ہوگیا، اس بابرکت اور

گھنے سایہ کے اٹھ جانے کے بعد آپ کے اندر ایک نئی تڑپ پیدا ہوئی، طبیعت کی استعداد کمال روحانیت کی طرف پلٹی، پیاس بڑھی اور بڑھتی چلی گئی، سامنے تھانہ بھون میں معرفت و سلوک کا ایک دریائے شیریں لہریں لے رہا تھا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب نے خود کو اس دریا میں ڈال دیا، حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ اس میدان کے مجتہد تھے، ان کا ایک خاص طریقۂ اصلاح و تربیت تھا، ان کے یہاں ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت کرنے کو بنیادی اہمیت نہ تھی، بلکہ باطنی اصلاح عمل اور شیخ سے مشورہ اور ان کی دی ہوئی ہدایات پر عمل بنیادی چیز تھی، چنانچہ مولانا نے پہلا خط جو حضرت تھانوی کو لکھا ہے اس میں تحریر فرماتے ہیں۔

> احقر کا ارادہ حضرت اقدس کے سلسلہ میں داخل ہوکر ذکر اذکار کرنے کا حسب تجویز حضرت اقدس ہے، لہٰذا گزارش ہے کہ بندہ کے مناسب حال جو حضرت تجویز فرمادیں اس پر ان شاء اللہ اہتمام کے ساتھ عمل کروں گا۔

حضرت حکیم الامت کا جواب ملاحظہ فرمائیے:

> گو میں حضرات اہل کمال کی خدمت کی اہلیت نہیں رکھتا لیکن تاہم خدمت سے عذر نہیں اور اصل خدمت مشورہ ہے، ایک طرف سے اطلاع حالات کا اور دوسری طرف سے مشورہ کا سلسلہ اگر جاری ہے، یہی داخل ہونا ہے سلسلہ میں والفوائد علی ہذا اولی بالحذف (اشرف السوانح ج ۳/۲۹۲)

اس مکتوب میں اصلاح باطن کی جو اصل ہے، حضرت تھانوی نے اسے واضح فرمادیا، اور یہ بھی فرمایا کہ اس کے سوا اور جو کچھ ہے، وہ زائد ہے، حضرت کے ملفوظات و مواعظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت ہونا بھی زائد ہے، داخل سلسلہ ہونے کے لئے کوئی لازمی امر نہیں ہے، دوسرے اکابر گو اس اجتہاد کے پابند نہ ہوں، مگر حضرت اقدس تھانوی قدس سرہٗ اس چیز کے بیان کردینے کا بہت اہتمام فرماتے تھے۔

چنانچہ اس مکتوب گرامی کے ذریعے مولانا عبدالرحمٰن صاحب داخل سلسلہ ہوگئے، پھر سلوک باطن اور اصلاح نفس کا عمل اتنے مرتب اور منظّم طریقے سے انھوں نے انجام دیا کہ

اس کی مثال کم ملتی ہے، اس مرتب ومنظّم سلوک واصلاح کو دیکھنا ہو تو اشرف السوانح ج ۳/ ۲۹۲ سے ۳۲۳ تک ملاحظہ ہو، یہ سینتیس (۳۷) خطوط ہیں اور حضرت تھانوی کے جوابی ارشادات ہیں۔ یہ سلسلۂ مکاتبت اور منظّم ومرتب سلوک خود حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کو اتنا پسند آیا کہ اسے آپ کی سوانح میں جز وکتاب بنا دیا گیا، اور خود حضرت نے اس کا نام مکاتیب عبادۃ الرحمٰن تجویز فرمایا، یہ خطوط ۳۰/ جمادی الاخری سے شروع ہوتے ہیں اور ۱۳/ رجب ۱۳۴۹ھ کو آخری خط لکھا گیا ہے، ربیع الثانی ۱۳۴۹ھ کی کسی تاریخ میں حضرت حکیم الامت نے بیعت کی اجازت دی، گویا دو سال کی مسلسل ریاضت اور مجاہدے کے بعد خلافت سے نوازے گئے، اس دوران ان ایک مرتبہ بھی حضرت مولانا نے بیعت کی درخواست نہیں پیش کی، انھیں حضرت اقدس حکیم الامت کا عندیہ معلوم ہو چکا تھا کہ داخل سلسلہ ہو چکے ہیں اور باقی امور کی ضرورت نہیں ہے، البتہ حصول خلافت کے بعد مولانا نے جو خط لکھا اس میں تحریر فرماتے ہیں۔

> ’’آئندہ جمعہ کو حضرت سلمہ کی خدمت میں حاضری کا ارادہ ہے، اگر حضرت اجازت فرما دیں، نیز احقر حضرت سے بیعت ہونے کے شرف سے اب تک محروم ہے، اگر حضرت سلمہ کے نزدیک مناسب ہو، تو حاضری پر شرف بیعت سے بھی مشرف فرمایا جائے۔

حضرت نے جواب میں تحریر فرمایا:

> ضرورت تو ہے نہیں، لیکن آپ کے حکم سے عذر بھی نہیں۔

یعنی داخل سلسلہ ہونے کے دو سال بعد بیعت کی رسم پوری ہوئی، یہ تصوف کی تاریخ میں ایک نادر مثال ہے جو حضرت حکیم الامت کے اجتہاد اور حضرت مولانا کے غایت اطاعت وانقیاد پر مبنی ہے۔ حضرت تھانوی کا اشارہ پایا کہ رسم بیعت کی حاجت نہیں ہے، تو پھر تذکرہ تک نہیں کیا، البتہ جب اجازت وخلافت سے نوازے گئے تو خیال آیا کہ یہ دستور بھی پورا کر لیا جائے، چنانچہ اس کا اظہار فرمایا، اور باوجود ضرورت نہ ہونے کے حضرت حکیم

الامت نے دل جوئی ودلداری کے مدنظر قبول فرمایا۔

حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کا باوجود کمال علم وفضل کے کیا حال ہوا، اور پوری زندگی کس حال میں گزاری، اس کی تعبیر ہم بطور خود کرنا چاہیں، تو شاید نہ کرسکیں، مولانا عاشق الٰہی میرٹھی نے تذکرۃ الرشید میں حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہ کے حالات میں جو فقرہ لکھا ہے، اسے ہم نقل کرتے ہیں، غالباً اس فقرے سے حضرت مولانا کے حال کی بھی ترجمانی ہوتی ہے، مولانا میرٹھی لکھتے ہیں۔:

> ''حضرت مولانا (رشید احمد) قدس سرہٗ فرمایا کرتے تھے کہ جب اعلیٰ حضرت (حاجی امداد اللہ صاحب) کے دست مبارک پر بیعت ہونے کا وقت آیا، تو میں نے عرض کیا حضرت مجھ سے ذکر وشغل اور محنت ومجاہدہ کچھ نہیں ہوسکتا اور نہ رات کو اٹھا جائے اعلی حضرت نے تبسم کے ساتھ فرمایا اچھا کیا مضائقہ ہے؟ اس تذکرہ پر کسی خادم نے دریافت کیا کہ حضرت پھر کیا ہوا؟ تو آپ نے جواب دیا، اور عجیب ہی جواب دیا، کہ پھر تو مرمٹا۔ (تذکرۃ الرشید ج۱/ ۴۸)

حضرت مولانا میرٹھی اس فقرہ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

> ''پھر تو مرمٹا'' صفحۂ ہستی پر آبِ زر سے لکھنے اور لوح دل پر قلم اذعان سے کندہ کرنے کے لائق ہے، حقیقت میں حضرت مولانا اس کے بعد مرمٹے، آپ نے رہتے نفس کو ماردیا، ہوائے نفس کو ملیامیٹ کردیا، جس پاک نام کے سیکھنے کا قصد کیا تھا اس میں کھپ گئے، فنائیت حاصل کی، اور اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فنا عن الفناء پر پہونچے کہ اپنی فنائیت سے بے خبر اور فانی محض بن گئے (ص ۴۹)

حضرت اقدس تھانوی قدس سرہ کے آستانہ پر حضرت مولانا کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہوا ''مرمٹے'' دین وایمان پر مرمٹے، محبت الٰہی میں مرمٹے، کمال علم اور وفور ذہانت کے باوجود ایسا مرمٹے جیسے کچھ نہ ہوں، اس فنائیت نے کہاں تک پہونچایا ہوگا، کسے خبر ہے؟

اتنا تو جانتے ہیں کہ عاشق فنا ہوا
اور اس سے آگے بڑھ کے خدا جانے کیا ہوا

تصوف وسلوک کی راہ سے یوں تو جامعہ مظاہر علوم سہارنپور کی برکتیں بہت ہیں، اتنی ہیں کہ ان میں جو معلوم ہیں، ان کا بھی شمار مشکل ہے، اور جو مخفی ہیں جن کا ادراک عام نگاہوں کو نہیں ہے، اور جو بسا اوقات خاص نگاہوں سے بھی پوشیدہ ہیں، جنھیں اللہ ہی جانتا ہے، انہیں کون شمار کرسکتا ہے، کچھ برکتوں کا اجمالی تذکرہ مضمون کے اخیر میں آئے گا۔ ان شاء اللہ

تاہم ایک برکت دل کا دامن پکڑ رہی ہے، اس کے ذکر کے بغیر مضمون ادھورا اور تشنہ معلوم ہورہا ہے، اور وہ برکت ہے جامعہ مظاہر علوم کے سابق ناظم حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب نوراللہ مرقدہٗ کی ذات والا صفات، حضرت ناظم صاحب نے عربی کی تعلیم کا آغاز تھانہ بھون میں حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کی سرپرستی میں کیا، وہاں کی روحانی وعرفانی فضا میں ۴؍سال گزارے، ترجمہ قرآن پاک اور مشکوٰۃ شریف حضرت اقدس حکیم الامت سے پڑھی، اس روح پرور ماحول میں معرفت ومحبت الٰہی کا کتنا نور دل وجان میں جذب ہوا ہوگا، اللہ ہی جانتا ہے، جس کا ظہور ساری عمر ہوتا رہا، پھر جامعہ مظاہر علوم میں داخلہ لیا دو سال یہاں رہ کر ۱۳۳۴ھ میں حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ کی رفاقت میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد دو سال مزید اکتساب فیض کرتے رہے، پھر وہیں معین مدرس اور مدرس بنادیئے گئے، پھر نائب ناظم اور ناظم بنائے گئے۔

حضرت ناظم صاحب راہ طریقت کے عظیم ترین سالک تھے، مظاہر کے بہت سے طالب علموں نے جو بعد میں بڑے بڑے علماء ہوئے، اور دوسرے لوگوں نے حضرت ناظم صاحب سے بیعت وارادت کا تعلق استوار کیا، حضرت کے فیض یافتوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔

حضرت ناظم صاحب کے متوسلین وخلفاء میں ایک بزرگ ایسے ہیں، جو مجموعۂ فضائل وکمالات ہوئے، اور وہ تنہا حضرت ناظم صاحب کی قوت فیض رسانی کی روشن دلیل ہیں۔ وہ باندہ کے بزرگ عالم حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب نوراللہ مرقدہٗ ہیں، جن

کے وجود باجود سے چند سالوں پہلے ہمارا ملک روشن وتابناک تھا، جن کے علم وفضل، جن کے مجاہدۂ وریاضت، جن کے مسلسل اسفار، جن کی دین اور علم دین کے لئے تڑپ، جن کے جذبۂ اصلاح، جن کی شفقت وعنایت اور جن کی محبوبیت ومقبولیت کی دھوم ملک میں اس سرے سے اس سرے تک مچی ہوئی تھی جن کے قدم جدھر اٹھ جاتے تھے، ایمان کی باد بہاری چل پڑتی تھی۔

حضرت مولانا سید صدیق احمد صاحب باندوی اس دور اخیر میں اللہ کی حجت بالغہ تھے، حضرت مولانا بھی مظاہر علوم کے فیض یافتہ ہیں ان کا ذکر آ گیا، تو روح کو بھی اور قلم کو بھی وجد آ گیا، ایسا ایک آدمی بھی اگر کسی ادارے سے نکل آئے تو وہ ادارہ کامیاب ہے، چہ جائیکہ اس ادارے سے بہت سے افراد تیار ہوکر نکلے ہوں۔

حضرت باندوی کی وفات کے بعد خاکسار نے ایک مضمون لکھا تھا، قلم کا تقاضا ہے کہ اس کے ابتدائی پیراگراف کو نقل کردوں۔ بات ذرا طویل ہے، لیکن کیا کروں کہ یہ داستاں طویل ہی اچھی اور لذیذ معلوم ہوتی ہے اگر کسی صاحب کو گرانی ہو، تو معاف کریں۔ ؎ لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم

بحرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از ذوق حضوری طول دادم داستانے را

ایک حرف میں ساری دنیا کی تمنا بیان کی جاسکتی ہے، مگر میں نے ذوق حضوری میں سرشار ہوکر داستان لمبی کردی ہے، بہر حال وہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

> ”اگر آج کسی سے پوچھا جائے کہ تم نے جنید وشبلی کو دیکھا ہے؟ بایزید بسطامی وابوالحسن خرقانی سے ملاقات کی ہے؟ شیخ عبدالقادر جیلانی وخواجہ معین الدین چشتی کی زیارت کی ہے؟ خواجہ نظام الدین اولیاء اور خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی سے ملے ہو؟ میاں جی نور محمد اور حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی خدمت میں حاضر ہوئے ہو؟ تو اس کا جواب یقیناً یہی ہوگا کہ نہیں!

پھر اس سے پوچھئے کہ تم نے باندہ والے حضرت قاری سید صدیق احمد صاحب کو دیکھا ہے؟ اگر وہ کہے کہ ہاں انھیں دیکھا ہے، انھیں سنا ہے، ان سے مصافحہ کیا ہے، ان کا مہمان رہا ہوں، اگر وہ یہ کہے تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ تم نے پچھلے بزرگوں کا جلوہ دیکھا ہے۔

جنید وشبلی کا علم وعرفان، بایزید بسطامی، ابوالحسن خرقانی کے مجاہدات و ریاضات، شیخ عبدالقادر جیلانی وخواجہ معین الدین چشتی کا فیضان عام، خواجہ نظام الدین وخواجہ نصیرالدین کی محبوبیت واتباع سنت، میاں جی نور محمد وحاجی امداداللہ کی روحانیت، سب کا نمونہ تم نے دیکھ لیا ہے۔

حضرت مولانا صدیق احمد صاحب اس دور ظلمت میں ایک ماہتاب ہدایت تھے، اللہ کی قدرت کاملہ کی حجت بالغہ تھے، اسلام کی حقانیت کی دلیل وبرہان تھے، وہ اس بات کے نشان تھے کہ آدمی خواہ کتنا ہی بے نوا ہو، ظاہری وسائل سے تہی دامن ہو، دورافتادہ وگمنام علاقہ میں ہو، جہل وضلالت کے ماحول میں ہو، لیکن اگر اس کے پاس ایمان کی طاقت، توکل کا سرمایہ، یقین کی پختگی، محبت کی سرشاری اللہ کے لئے اخلاص سے سنت پر عمل اور دین کا سچا درد ہو، تو بے نوائی کی تہوں سے اس کے لئے بال وپر پیدا ہوں گے، اسباب ووسائل سے تہی دامنی کامیابی کا زینہ بن جائے گی، علاقہ کی گم نامی اس کی شہرت ومقبولیت کا دروازہ ثابت ہوگی، جہل وضلالت کی چٹانوں سے علم و معرفت کے سرچشمے ابل پڑیں گے۔

حضرت ناظم صاحب کی زبردست روحانیت ظاہری طاقت بھی بن کر ظاہر ہوتی۔ ۱۳۸۸ھ میں جب یہ خاکسار دارالعلوم دیوبند تعلیم کے لئے حاضر ہوا تھا، تو ایک جمعہ کو سہارنپور حاضری ہوئی، جامع مسجد میں جمعہ کی نماز کیلئے پہونچا تو دیکھا کہ ایک نحیف ونزار اور ضعیف ولاغر بزرگ جو نور کے پیکر محسوس ہورہے تھے جن کے صرف چہرے سے نہیں پورے ~~وجود سے روشنی کی شعاعیں نکل رہی تھیں، لوگ انھیں تھامے لئے آرہے تھے، خود سے چلنے~~

اور اٹھنے بیٹھنے کی طاقت نہیں تھی، انھیں خدام نے پہلی صف میں لا کھڑا کیا، اور انھوں نے کھڑے ہوکر نماز شروع کردی اور اتنی طویل نماز پڑھی کہ میں حیرت زدہ رہ گیا، شاید وہ صلوۃ التسبیح تھی، بہت اطمینان سے رکوع وسجود کے ساتھ انھوں نے نماز ادا کی، سلام پھیرنے کے بعد خادم نے اٹھا کر پھر کھڑا کیا، اب چار رکعت انھوں نے مختصر مگر باطمینان ادا کی، پھر جمعہ کی نماز اور اس کے بعد کی سنتیں ادا کیں، نماز میں ہوتے تو اٹھنے بیٹھنے اور رکوع وسجود کسی میں سہارے کی ضرورت نہ ہوتی، اور نماز سے فارغ ہونے کے بعد سہارے کی ضرورت پڑتی، میں حیرت سے دیکھتا رہا کسی سے پوچھا کہ کون بزرگ ہیں؟ بتانے والے نے بتایا کہ حضرت ناظم صاحب ہیں۔

جامعہ مظاہر علوم جن بزرگوں کے زیر سایہ پروان چڑھا، وہ سب علم شریعت کے ساتھ علم طریقت کے بھی جامع تھے، اس لئے جامعیت کے ساتھ اتنی قد آور شخصیتیں پیدا ہوئیں کہ ان سے ایک دنیا کی دنیا روشن ہوئی، ان میں سے مزید چند بزرگوں کا اجمالاً تذکرہ کرتا ہوں۔

(۱) حضرت مولانا امیر باز خاں صاحب سہارنپوری علیہ الرحمہ

جامعہ مظاہر علوم کے ابتدائی فارغین میں ہیں۔ ۱۲۸۷ھ میں فارغ ہوئے، اور راہ طریقت میں حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہارنپوری سے بیعت ہوئے، جو سلسلۂ قادریہ و نقشبندیہ کے بڑے اصحاب نسبت میں تھے، احوال العارفین میں لکھا ہے کہ:

آپ خلیفۂ اول اور منتظم خانقاہ تھے، واعظ، خطیب، مفتی، قاضی اور مجاہد، صغیر وکبیر تھے، آپ یوپی اور پنجاب کے علاقوں میں دورے کرتے، جس میں ارشاد و تلقین اور دعوت الی اللہ غرض ہوتی تھی، چنانچہ حضرت مولانا عبداللہ صاحب جلال آبادی ثم کرنالوی قدس سرہ تحریر فرماتے ہیں کہ آپ ایک دفعہ کرنال تشریف لائے، وہاں دو ماہ قیام فرمایا، آپ کے قدوم میمنت لزوم سے عجیب وغریب معاملات کراموں کا ظہور ہوا، گویا سنت نبوی ﷺ کا ایک آفتاب ہدایت بزرگی اور اجلال کے ساتھ افق سے طلوع ہوا، اور شرک و بدعت کی

تاریکی اس شہر سے ختم ہوئی۔ (علمائے مظاہر ج۱/۳۸۱)، ۱۳۳۵ھ میں انتقال ہوا)۔

(۲) حضرت مولانا محمد اشرف علی سلطان پوری جالندھری

۱۲۹۵ھ میں جامعہ مظاہر علوم سے فارغ ہوئے، حضرت گنگوہی قدس سرہ کے مبارک ہاتھوں پر بیعت ہوئے، اجازت وخلافت سے نوازے گئے اپنی جگہ رہ کر اپنی خدمات انجام دیں۔

(۳) حضرت مولانا حافظ سید تجمل حسین صاحب دیسنوی علیہ الرحمہ

جامعہ مظاہر علوم سے ۱۲۹۵ھ میں سند فراغت حاصل کی، حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری سے بخاری شریف اور مسلم شریف پڑھی۔

حضرت مولانا شاہ فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی سے بیعت ہوئے، اور خلافت و اجازت سے نوازے گئے، ایک عرصہ تک مکہ مکرمہ میں حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی کی صحبت بابرکت میں رہے، بہت ہی صاحب حال اور بابرکت بزرگ تھے، ۱۳۴۲ھ میں وصال ہوا۔

(۴) حضرت مولانا سید محمد علی مونگیری قدس سرہٗ

حضرت مولانا کی ذات گرامی محتاج تعارف نہیں ہے، حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے بڑے خلیفہ ہیں، رشد و ہدایت میں متقدمین کی یادگار تھے، صاحب علم و صاحب تقوی تھے، حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی سے بھی خلافت حاصل تھی، حضرت مولانا ندوۃ العلماء لکھنو کے بانی وموسس ہیں۔

۱۲۹۳ھ میں حدیث کی کتابیں پڑھنے کے لئے جامعہ مظاہر علوم تشریف لائے، اور حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی خدمت میں سال بھر رہ کر حدیث کی کتابیں پڑھیں، اور ان سے اجازت حاصل کی۔ (نزہۃ الخواطر ۸/۴۷۰)

تاریخ مظاہر میں ہے کہ:

> ۱۲۹۳ھ میں مدرسہ کی سابقہ تعمیر گویا تکمیل پا چکی تھی، اس لئے شوال سن رواں میں مدرسہ محلّہ قاضی سے منتقل ہوا، ۸؍شوال کو انتقال مدرسہ کی تقریب پر اس جدید مکان میں جلسہ ہوا، جس میں حضرت اقدس مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی نے تین گھنٹہ مسلسل وعظ فرمایا، حضرت مولانا احمد علی صاحب (محدث) اب تک اپنے دولت کدے پر تدریس فرماتے تھے، اس سال سے مدرسہ ہی میں تعلیم و تدریس کا سلسلہ شروع فرمایا (ج۱/۳۰)

اس روداد سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت مولانا محمد علی قدس سرہ نے مدرسہ کی نئی تعمیر میں تعلیم حاصل کی، اس سال کی روداد میں ہے کہ:

> چونکہ حضرت مولانا احمد علی صاحب نے بھی امسال مدرسہ میں ہی قیام فرما کر تعلیمی و تدریسی سلسلہ شروع فرمادیا، اور حضرت کی شہرت نواح ہند میں جیسی ہونی چاہئے تھی وہ ظاہر ہے، اس لئے طلبہ حدیث میں بہت اضافہ ہوا، اور پچیس طلبہ حدیث کی تکمیل فرما کر اطراف ہند میں مصابیح ہدایت بنے۔ (ج۱/۳۱)

ان طلبہ میں مولوی حافظ محمد علی کان پوری کا بھی نام ہے، اس سے مراد یہی حضرت مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری ہیں، جو اس وقت کانپوری تھے، بعد میں حضرت مولانا فضل رحمٰن صاحب گنج مرادآبادی کے حکم سے مونگیری ہوئے، ۱۳۴۶ھ میں انتقال ہوا۔

(۵) کرنال صوبۂ پنجاب کے قوی النسبت

صاحب جذب بزرگ حضرت مولانا عبداللہ شاہ صاحب، اصلاً جلال آباد ضلع مظفر نگر کے رہنے والے تھے، اپنے شیخ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب سہانپوری کے حکم سے کرنال کو آباد فرمایا۔

حضرت مولانا عبداللہ صاحب نے ۱۲۹۲ھ میں جامعہ مظاہر علوم میں حضرت مولانا احمد علی صاحب محدث سہارنپوری کی خدمت میں حدیث کی کتابیں پڑھیں۔ اس دور میں حضرت مولانا امیر باز خاں صاحب کے ہمراہ حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے، پھر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئے، اور اجازت و خلافت سے نوازے گئے۔

حضرت شاہ صاحب کے خلیفۂ اول حضرت مولانا امیر باز خاں صاحب تھے، خلیفہ دوم حضرت مولانا عبداللہ صاحب اور خلیفۂ سوم حضرت مولانا شاہ ابوالحسن صاحب سہارنپوری تھے، حضرت شاہ عبدالرحیم صاحب رائپوری بھی ان کے خلیفہ تھے، یہ حضرات جامعہ مظاہر علوم کے فیض یافتہ تھے، اور حضرت سے رشد و ہدایت اور سلوک وطریقت کا فیضان عام ہوا، ۱۳۴۳ھ میں رحلت فرمائی۔

علماء مظاہر علوم کی ایک بڑی تعداد ہے، جن کے ذریعے سے تصوف وطریقت اور ذوق احسان وسلوک عام ہوا، ان کے فیض سے مردہ قلوب نے زندگی پائی، ان کے انوار نسبت سے خطے کا خطہ منور ہوا، انہیں اگر ہم گننا بھی چاہیں تو گن نہیں سکتے، ۱۲۸۳ھ سے ۱۴۲۶ھ تک ۱۴۳ سال کا طویل عرصہ ہے، اس عرصہ میں اللہ ہی جانتا ہے کتنے روحانیوں نے جامعہ مظاہر علوم میں تربیت پائی ہوگی۔ اور شریعت وطریقت کا چشمہ شیریں ان کے فیض سے جاری ہوا ہوگا۔

حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب جونپوری، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب ہردوئی، حضرت مولانا عبدالجبار صاحب اعظمی، حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب بلندشہری، حضرت مولانا عبیداللہ صاحب بلیاوی، حضرت مولانا مفتی محمود حسن صاحب گنگوہی، حضرت مولانا محمد یوسف صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا انعام الحسن صاحب کاندھلوی، حضرت مولانا محمد فاروق صاحب الٰہ آبادی، حضرت مولانا قاری حبیب احمد صاحب الٰہ آبادی رحمہم اللہ۔

یہ حضرات وہ ہیں جنھوں نے تصوف وسلوک کی راہ سے بزرگوں کی صحبت میں رہ کر خود بھی نسبت باطنی حاصل کی، اور ان کے واسطے سے بہتوں کو فیض پہنچا۔

ایک حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب قدس سرہٗ سے یہ سلسلہ مبارکہ جو چلا ہے، تو اس کے حدود ملک سے باہر اقصائے ایشیا اور یورپ اور افریقہ بلکہ امریکہ تک پھیل گئے ہیں۔ حضرت شیخ کے خلفاء ومتوسلین[1] ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں، حضرت مفتی محمود حسن صاحب، حضرت مولانا عبدالحلیم صاحب، حضرت مولانا ابرارالحق صاحب اور دوسرے اکابر

کا فیضان بھی دور ونزدیک جاری ہے۔ یہ داستان بہت لمبی ہے، اس کا کچھ حصہ بھی بیان کرنا ہوتو ضخیم ضخیم کئی جلدیں ہو جائیں گی، بھلا یہ مقالہ کہاں اس کی گنجائش رکھتا ہے۔

قلم بشکن، سیاہی ریز، کاغذ سوزدم درکش
حسن ایں قصۂ عشق است در دفتر نمی گنجد

---

[۱] حضرت شیــــخ کے خلفاء ومجازین کا تعارف دو ضخیم جلدوں میں مولانا محمد یوسف متالا نے جمع کیا ہے، کتاب کا نام ہے "حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا مہاجر مدنی نور اللہ مرقدہٗ اوران کے خلفاء کرام" یہ تین جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں حضرت شیخ کا تذکرہ ہے، اور باقی دو جلدوں میں خلفاء کا تعارف ہے۔

☆☆☆☆☆

ضمیمہ (۱)

مقالہ میں حضرت شاہ عبد الرحیم صاحب سہارنپوری علیہ الرحمہ کا تذکرہ آیا ہے، انھیں کے ہم نام شاہ عبد الرحیم صاحب رائپوری نور اللہ مرقدہٗ تھے، جو اول الذکر سے بیعت اوران کے خلیفہ تھے، انکے خلفاء میں حضرت مولانا امیر باز خاں صاحب، حضرت مولانا عبد اللہ شاہ کرنالی اور حضرت مولانا شاہ ابو الحسن صاحب سہارنپوری بھی ہیں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مختصر تعارف کرادیا جائے، حضرت مولانا سید ابو الحسن علی صاحب ندوی علیہ الرحمہ نے سوانح شاہ عبد القادر رائپوری میں ان کا تذکرہ کیا ہے، اسے نقل کیا جاتا ہے، لکھتے ہیں۔

> حضرت میاں صاحب سرساوہ ضلع سہارنپور کے رہنے والے تھے، اگر (یہ خاندانی) روایت صحیح ہے کہ ۸۹؍ سال کی عمر میں ان کی وفات ہوئی تو ولادت ۱۲۱۴ھ میں ہوئی ہوگی، حضرت (شاہ عبد القادر صاحب) رحمۃ اللہ علیہ حضرت میاں صاحب کے نہایت دل آویز اور بڑے رفیع حالات سنایا کرتے تھے، ان کی مدد سے ان کا مختصر تذکرہ اور تعارف مرتب ہوسکتا ہے۔

فرماتے تھے کہ میاں صاحب حضرت حاجی اخوند صاحب سوات کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور بیعت کی درخواست کی، حاجی صاحب نے بیعت فرمالیا، اور شرط کی کہ انگریزوں کی نوکری نہیں کروگے، ورنہ بیعت شکست ہوجائے گی، وہ بیعت کرکے چلے

آئے، لیکن بعض حالات ایسے پیش آئے کہ انھوں نے نوکری کرلی پھر جب سید وشریف حاضری ہوئی تو اخوند صاحب نے آپ کو دیکھ کر فرمایا کہ جا تو ہمارے کام کا نہ رہا، آپ پندرہ روز تک وہاں روتے رہے، اخوند صاحب نے بلا کر دوبارہ اسی شرط پر بیعت لی، اور وہیں کے ہو رہے، وہاں سید وشریف میں ایک غار میں معمولات پورے کرتے تھے، ایک روز اس غار کے اوپر ایک چٹان پر شیر ببر آ کر بولنے لگا، اس کی آواز سے پہاڑ کی چوٹی سے پتھر گرنے لگے، فرماتے تھے، ذرا سکون میں فرق آیا، پھر اپنا ذکر اسی قوت سے شروع کر دیا۔

بڑے قوی النسبت اور صاحب کشف وتصرف بزرگ تھے، اخیر عمر میں اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا، اس کے باوجود روزانہ سو رکعتیں نفل پڑھا کرتے تھے، خادم کھڑا کر دیتے تھے، آپ نفل پڑھنے لگتے، اور اٹھنے بیٹھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی تھی، کشف کا یہ حال تھا کہ مرزا غلام احمد قادیانی کی شہرت اور دعوے سے بہت دن پہلے حکیم نورالدین صاحب مہاراجہ جموں کی صحت کے لئے دعا کرانے کے لئے آتے تھے، فرمایا تمہارا نام نورالدین ہے؟ حکیم صاحب نے کہا ہاں! فرمایا علاقۂ قادیان میں ایک غلام احمد پیدا ہوا ہے، جو کچھ عرصے کے بعد ایسے دعوے کرے گا، جو نہ اٹھائے جائیں گے، نہ رکھے جائیں گے، تم اس کے مصاحب لکھے ہوئے ہو، حکیم صاحب نے استعجاب کا اظہار کیا، تو فرمایا تم میں الجھنے کی عادت ہے اور مناظرہ کا شوق ہے، یہی عادت تم کو وہاں لے جائے گی۔

باوجود کشف وکرامت وعلوِ مرتبت کے مزاج میں بہت تواضع ومسکنت تھی، فرماتے تھے جب میں بازار سے گزرتا ہوں اور لوگ سلام کرتے ہیں تو گھڑوں پانی پڑ جاتا ہے، ندامت میں ڈوب جاتا ہوں۔

انتقال بھی عجیب طریقے سے ہوا۔ ایک دن گھر سے خوش دامن صاحبہ نے آواز دی کہ میاں صاحب رقیہ (چھوٹی بچی) روٹھی ہوئی ہے، اسکو مناؤ، فرمایا کیسی رقیہ؟ اور کس کی رقیہ؟ ہم نے اپنے روٹھے کو منا لیا، یہ کہہ کر ایک مرتبہ **لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کہا، کروٹ لی اور سفر آخرت پر روانہ ہوگئے۔

مولانا عبداللہ شاہ کرنالی تعلیمات رحیمی میں تحریر فرماتے ہیں کہ حضرت پیرومرشد (حضرت میاں صاحب سہارنپوری) بدرجۂ غایت متبع سنت اور محترز از بدعت تھے، کسی عرس اور محفل رقص وسرور وشعر خوانی میں شریک نہ ہوتے تھے، اور اپنے خادمان کو اتباع شریعت کا تقید فرماتے تھے اور بدعات سے منع فرماتے تھے۔

۲۱/ ربیع الاول ۱۳۰۳ھ روز دوشنبہ وقت شب میاں صاحب کی وفات ہوئی (سوانح حضرت مولانا عبدالقادر رائپوری ۳۲۰)

ضمیمہ (۲)

حضرت میاں عبدالرحیم سہارنپوری قدس سرہٗ کے مربی اور شیخ صوبہ سرحد کے علاقہ سوات وغیرہ کے مشہور مجاہد حریت اور شیخ طریقت حضرت اخوند حاجی عبدالغفور صاحب سواتی قدس سرہٗ عرف سیدو بابا ہیں، حضرت میاں صاحب ان کے اجل خلفا میں ہیں، حضرت اخوند صاحب قدس سرہٗ نے اس علاقہ میں انگریز سامراج کے خلاف جہاد آزادی کی قیادت فرمائی تھی، اور پھر آپ ہی کی کوششوں سے علاقہ سوات دُبَیر میں قبائل کی ایک آزاد حکومت قائم ہوئی تھی، آپ کی خانقاہ مجاہدانہ خصوصیات کی حامل تھی، آپ کے ایک خلیفہ قاضی سلطان محمود صاحب جو کہ ایک طویل سفر کر کے وہاں پہونچے، سیدو شریف کا آنکھوں دیکھا حال بیان کرتے ہیں۔

> جہاد کی ہر طرف تیاریاں ہو رہی تھیں، لشکر جمع ہو رہا تھا، روپئے اور ہتھیار تقسیم ہو رہے تھے، حضرت اخوند صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی مسجد میں اسلحہ سازی کے اٹھارہ انیس کارخانے قائم تھے، اور ہتھیار بن رہے تھے، آپ اتنے مصروف تھے کہ قدم بوسی دشوار تھی۔

آپ میں جذبۂ جہاد کا اس قدر غلبہ تھا کہ جنگ امبیلہ ۱۸۶۳ء مطابق ۱۲۸۲ھ میں آپ نے انگریزی فوج کے ایک سپہ سالار جنرل جمیرلین سابق وزیر اعظم برطانیہ کے مقابلہ پر جو کارہائے نمایاں سرانجام دئے وہ آزادی کی تاریخ کا سنہرا باب ہے۔

حضرت اخوند صاحب سید و بابا قدس سرہ کے دیگر خلفاء مولانا نجم الدین ہڈے ملا (۱۳۱۹ھ مطابق ۱۹۰۱ء) بھی ہیں جن کے خلفاء میں حضرت حاجی فضل واحد صاحب ترنگ زنی بڑی شہرت رکھتے ہیں حاجی صاحب ترنگ زنی نے تحریک ریشمی رومال میں حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شاہ عبد الرحیم رائپوری کی زیر قیادت بڑھ چڑھ کر مجاہدانہ کارنامے سرانجام دیئے۔

حضرت اخوند صاحب، امیر المومنین سید احمد شہید قدس سرہ کے ساتھ بعض جہادوں میں شریک رہے ہیں، وفات ۱۲۹۵ھ میں ہوئی (حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری ص ۱۰۸)

☆☆☆☆☆

اس مضمون کی تحریر میں حسب ذیل کتابوں سے مدد لی گئی ہے۔

(۱) آپ بیتی حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب نور اللہ مرقدہٗ
(۲) اشرف السوانح سوانح حضرت اقدس تھانوی، مرتبہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ
(۳) تاریخ مظاہر جلد اول حضرت شیخ الحدیث
(۴) تذکرۃ الرشید حضرت مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ
(۵) تذکرۃ الخلیل 〃 〃
(۶) تجلیات رحمانی، سوانح حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب کامل پوری، مرتبہ قاری سعید الرحمٰن صاحب
(۷) تذکرہ شیخ ہالیجوی، سوانح حضرت مولانا حماد اللہ صاحب سندھی، مرتبہ اعجاز احمد اعظمی (مطبوعہ: فرید بک ڈپو دہلی)
(۸) حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب، مولانا مفتی عبدالخالق آزاد، لاہور
(۹) سیرت سید احمد شہید حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ
(۱۰) علمائے مظاہر اور ان کی علمی و تصنیفی خدمات۔ مولانا سید محمد شاہد سہارنپوری

(۱۱) مکاتیب رشیدیہ حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ
مرتبہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھی

(۱۲) **نزھة الخواطر (الاعلام بمن فی تاریخ الھند من الاعلام)**
حضرت مولانا عبدالحی صاحب حسنی

(۱۳) ارواح ثلاثہ، (امیر الروایات الطیب اور اشرف التنبیہ کا مجموعہ، بحاشیہ حضرت تھانوی قدس سرہٗ)

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تصوف ہمارا قیمتی سرمایہ

ادھر چند برسوں میں اہل اسلام کے درمیان سے علم وفضل اور زُہد وتقویٰ کے لحاظ سے ممتاز، اتنی بڑی بڑی شخصیتیں مسلسل اٹھتی چلی گئی ہیں کہ کم از کم ہندوستان کے دینی بلکہ انسانی حلقوں میں ایک نا قابل تدارک خلاء محسوس ہونے لگا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کی تاریکی اور دھوئیں میں یہ نورانی ہستیاں گھٹن اور وحشت محسوس کرنے لگی تھیں، اس پر حق تعالیٰ نے یکے بعد دیگرے ایک بڑی تعداد کو اپنی آغوشِ رحمت میں بلالیا۔

یہ تو حقیقت ہے کہ انسان دنیا میں مسافرانہ وارد ہوا ہے، اس کا سفر برابر طے ہو رہا ہے، ہر روز ایک انسانی قافلہ شب وروز کی راہ قطع کرتا ہوا عدم کی منزل میں گم ہو جاتا ہے، تاہم ہر روز ایک نیا قافلہ اس دنیا میں وارد ہو کر جانے والوں کی جگہ پُر کر لیتا ہے، لیکن انھیں جانے والوں میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا جانا دنیا کو بہت محسوس ہوتا ہے، وہ رحمت وبرکت کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔ ان کے سائے میں ایک عالم کا عالم راحت پاتا ہے، ان کے وجود سے دلوں میں روشنی محسوس ہوتی ہے، ان کی صحبت میں سکون واطمینان کی چادر سی تنی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ لوگ جب چلے جاتے ہیں تو بے شمار انسان بے سایہ اور بے سہارا لگنے لگتے ہیں، پھر دنیا کے ستائے ہوئے لوگ، مصیبت کے مارے ہوئے لوگ، علم وعمل کے پیاسے لوگ، گزر جانے والوں کا بدل تلاش کرتے ہیں اور نہیں پاتے، تو انھیں دہری مصیبت کا احساس ہونے لگتا ہے۔

ہم کئی سال سے جن شخصیتوں کو کھوتے چلے جا رہے ہیں، وہ اسی شان کی تھیں جس

کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے۔ ان میں سے ہر شخصیت ایسی ہی تھی کہ آج ان کا بدل تلاش کرنے سے نہیں ملتا۔ یہاں ان سطروں میں ہم ان بزرگانِ رفتہ کا ماتم نہیں کرنا چاہتے، بلکہ اس پر غور کرنا چاہتے ہیں، اور اپنے اخوان واحباب کو دعوتِ فکر دینا چاہتے ہیں کہ گزر جانے والی نسل میں وہ کیا خاص بات تھی جس کی وجہ سے وہ ساری انسانیت کے لئے پناہ گاہ بن گئے تھے، اور ان کے سائے میں ہر آنے والا سکون اور خنکی محسوس کرتا تھا، اور موجودہ نسل سے وہ کیا چیز گم گئی ہے کہ اس کے پاس سوزش، تکلیف، پیاس اور بے اطمینانی کے سوا اور کچھ نہیں ملتا۔

لوگوں کے رُجحانات بدلے ہوئے ہیں، ہوا کا رُخ کچھ اور ہے، اس سے ہٹ کر گفتگو کرنا اپنے آپ کو موردِ طعن بنانا ہے، لیکن جو بات کہنے کی ہے اسے ''حلقۂ یاراں'' میں لانا ضروری ہے، شاید دلوں کی آنکھ کھلے، شاید کسی کو نفع ہو۔

جب ہم ان بزرگوں کی زندگی اور ان کی سیرت وشمائل پر غور کرتے ہیں تو یہ حقیقت نمایاں طور پر نظر آتی ہے کہ جن کمالات کی وجہ سے انھیں دنیا نے اپنے دل میں جگہ دی ان کا اصل منبع اور سرچشمہ وہی چیز ہے جسے آج کل اسلام میں شجرِ ممنوعہ قرار دیا جارہا ہے، وہ کیا ہے؟ وہ تصوف ہے۔ یہ سارے حضراتِ اکابر تصوف کے ذوق آشنا ہی نہیں عملاً اس کوچہ کے رہ نورد اور اس طریق کے سالک تھے، اسی تصوف نے ان کی زندگیوں میں اس درجہ حلاوت، کیف اور چاشنی بھر دی تھی کہ جو بھی ان کی صحبت میں پہونچ گیا وہ ان میں جذب ہو کر رہ گیا۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَمَا أُمِرُوْا إِلَّا لِيَعْبُدُوْا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الْدِّيْنَ ۔ ان کو جو حکم ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کی عبادت اخلاص کے ساتھ کریں۔ اور اسی اخلاص میں آدمی ترقی کرتا ہے تو اسے مرتبۂ احسان حاصل ہوتا ہے، جو عبادت اور دین کا اصل جوہر ہے، اس کو حاصل ہونے کے بعد آدمی کا رُواں رُواں صدا دینے لگتا ہے کہ إِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ۔ بے شک میری نماز، میری قربانی بلکہ میری زندگی اور موت محض اللہ کے لئے ہے جو سارے عالم کا پروردگار ہے۔

اسی اخلاص اور احسان کو حاصل کرنے کا طریقہ اور اس تک پہونچنے کا راستہ

تصوف کے نام سے معروف ہے۔ اب خواہ کوئی اس نام سے بھڑکے یا اسے غیر اسلامی چیز قرار دے، مگر یہ حقیقت ہے کہ اس راہ کو اپنائے بغیر اخلاص اور احسان کے نام اور اس کی علمی تشریحات کی معرفت تو ہوسکتی ہے، لیکن آدمی کا دل ودماغ اور اس کا ریشہ ریشہ اس کی حلاوت سے سرشار ہوجائے، اس کا حصول مشائخ کی صحبت اور تصوف کی عملی مشق کے بغیر بہت دشوار ہے۔ یہ ایک حقیقت ثابتہ ہے آدمی خواہ اس سے صرفِ نظر کرے، مگر اس کے بغیر اسے اپنی زندگی میں خلاء ضرور محسوس ہوتا ہے، بشرطیکہ حس ماؤف نہ ہوچکی ہو۔ آج دنیا میں انسان اپنے کو بہت سی لایعنی مشغولیات میں مبتلا کر کے حقائق سے فرار اختیار کرتا ہے مگر مرض اور بڑھاپا تمام لایعنی مشغلوں کو چھڑا دیتا ہے۔ اس وقت بہت سے لوگوں کو اپنی کمی کا احساس ہونے لگتا ہے، اور اصحاب توفیق اس پر پہلے ہی متنبہ ہوجاتے ہیں۔ اس سلسلے میں مشہور ومعروف صاحب علم وتدریس حضرت امام غزالی علیہ الرحمہ کا اعتراف اور ان کی آپ بیتی ملاحظہ کر لینی چاہئے۔ یہ صرف انھیں کے دل کی آواز نہیں ہے، بلکہ غور کریں گے تو بکثرت اصحاب علم وفضل کے دل کی گہرائیوں سے یہ صدا نکلتی ہوئی محسوس ہوگی، یہ اور بات ہے کہ امام غزالی نے اس صدا پر لبیک کہی اور بہت سے حضرات اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔ امام غزالی کی تحریر کا یہ اقتباس ہم حضرت مولانا سیّد ابوالحسن علی ندویؒ کی مایہ ناز کتاب ''تاریخ دعوت وعزیمت'' حصہ اول سے نقل کرتے ہیں۔ امام صاحب علوم وفنون کی کئی بے برگ وگیاہ وادیوں کا جائزہ لینے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

> ''اب صرف تصوف باقی رہ گیا ہے، میں ہمہ تن تصوف کی طرف متوجہ ہوا، تصوف علمی بھی ہے اور عملی بھی۔ میرے لئے علم کا معاملہ آسان تھا، میں نے ابوطالب مکی کی ''قوت القلوب'' اور حارث محاسبی کی تصنیفات، اور حضرت جنید وشبلی وبایزید بسطامی وغیرہ کے ملفوظات پڑھے اور علم کے راستے سے جو کچھ حاصل کیا جاتا تھا، وہ میں نے حاصل کر لیا، لیکن مجھے معلوم ہوا کہ اصلی حقائق تک تعلیم کے ذریعہ سے نہیں، بلکہ ذوق وحال اور حالات کی تبدیلی سے پہونچا جاسکتا ہے، جو علوم میرا سرمایہ تھے خواہ شرعی

> ہوں یا عقلی، ان سے مجھے وجودِ باری، نبوت اور معاد پر ایمان راسخ حاصل ہو چکا تھا، لیکن یہ بھی کسی دلیل محض سے نہیں بلکہ ان اسباب وقرائن اور تجربوں کی بنا پر جن کی تفصیل مشکل ہے، مجھ پر یہ اچھی طرح واضح ہو چکا تھا کہ سعادتِ اُخروی کی صورت صرف یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کیا جائے اور نفس کو اس کی خواہشات سے روکا جائے، اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ دارِ فانی سے بے رغبتی، آخرت کی طرف میلان وکشش اور پوری یکسوئی کے ساتھ توجہ الی اللہ کے ذریعہ قلب کا علاقہ دنیا سے ٹوٹ جائے، لیکن یہ جاہ ومال سے اعراض اور موانع وعلائق سے فرار کے بغیر ممکن نہیں۔ میں نے اپنے حالات پر غور کیا تو مجھے معلوم ہوا کہ میں سرتاپا دُنیوی علائق میں غرق ہوں۔ میرا سب سے افضل عمل تدریس وتعلیم کا معلوم ہوتا تھا، لیکن ٹٹولنے سے معلوم ہوا کہ میری تمام تر توجہ ان علوم کی طرف ہے جو نہ اہم ہیں اور نہ آخرت کے سلسلے میں کچھ فائدہ پہونچانے والے ہیں۔ میں نے اپنی تدریس کی نیت کو دیکھا تو وہ بھی خالص لوجہ اللہ نہ تھی، بلکہ اس کا باعث ومحرک بھی محض طلب جاہ وحصول شہرت تھا، تب مجھے یقین ہو گیا کہ میں ہلاکت کے غار کے کنارے کھڑا ہوں، اگر میں نے اصلاح حال کے لئے کوشش نہ کی تو میرے لئے سخت خطرہ ہے۔''

اس کے بعد امام غزالیؒ اپنی اندرونی کش مکش، ایمان ونفس کی آویزش، پھر اس کی وجہ سے اپنے مبتلائے امراض ہونے کا ذکر کرتے ہیں۔ اس کے بعد بغداد سے نکلنے، تدریس کو چھوڑنے، لوگوں کے افسوس کنے کا تفصیلی تذکرہ کرتے ہوئے اپنے دس سالہ مجاہدات کا اجمالاً ذکر کرنے کے بعد انھوں نے بطور خلاصہ کے تحریر فرمایا ہے کہ:

> ''ان تنہائیوں میں مجھے جو کچھ انکشافات ہوئے، اور جو کچھ مجھے حاصل ہوا، اس کی تفصیل اور استقصاء تو ممکن نہیں، لیکن ناظرین کے نفع کے لئے اتنا ضرور کہوں گا کہ مجھے یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ صوفیہ ہی اللہ کے راستے کے سالک ہیں، ان کی سیرت بہترین سیرت، ان کا طریق سب سے مستقیم اور ان کے اخلاق سب سے زیادہ

> تربیت یافتہ اور صحیح ہیں۔ اگر عقلاء کی عقل، حکماء کی حکمت اور شریعت کے رمز شناسوں کا علم مل کر بھی ان کی سیرت و اخلاق سے بہتر لانا چاہے تو ممکن نہیں۔ ان کے ظاہری و باطنی حرکات و سکنات مشکوٰۃِ نبوت سے ماخوذ ہیں، اور نورِ نبوت سے بڑھ کر روئے زمین پر کوئی نور نہیں جس سے روشنی حاصل کی جائے۔'' (المنقذ من الضلال)

یہ عاقل ترین عالم کی شہادت ہے اور بلاشبہہ صحیح اور قابل اعتماد ہے، جو لوگ تصوف کے منکر ہیں ان سے تو کچھ نہیں کہنا ہے، لیکن جو حضرات اس کے قائل و معترف ہیں انھیں عملاً اس کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، وہ زندگی بھی کوئی زندگی ہے جو صرف دنیا اور دنیاوی متاع و اسباب کے لئے بسر ہو، زندگی تو وہی ہے جو صرف اللہ کی رضا جوئی کے لئے ہو اور اس کی رضا جوئی کی عملی مشق کا نام تصوف ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بہت سے لوگوں نے غیر مخلصانہ طریق پر تصوف میں قدم رکھا، اور انھوں نے اپنے اعمال و کردار سے اس پاک طریقہ کو بدنام کیا، لیکن کیا کچھ غلط افراد کی ناکردنی کے باعث اس ضروری عمل کو چھوڑ دیا جائے، ہرگز نہیں۔ تصوف انسان کو کہاں سے کہاں تک پہونچاتا ہے، اس کا بیان ایک بڑے صاحب علم و عقل اور زبردست دنیوی وجاہت کے مالک نواب صدر یار جنگ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی علیہ الرحمہ کی زبانی سنئے! وہ اپنے زمانے کے مشہور شیخ طریقت حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ کی خدمت میں پہونچے تو ان کا کیا تاثر تھا، اسے ملاحظہ فرمایئے اور اندازہ کیجئے کہ تصوف آدمی کو کن بلندیوں تک پہونچا دیا کرتا ہے، بشرطیکہ اس کو اخلاص و صدق کے ساتھ اختیار کیا جائے۔ فرماتے ہیں:

> حضرت کی خدمت میں پہونچ کر دو زبردست خیالات میرے دل میں طاری ہوئے، جن کے سبب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ میں نے حضرت کا مرتبہ پہچان لیا، لیکن یہ جانا کہ ہم میں اور ان میں سوائے ظاہری مشابہت کے اور کوئی مشابہت نہیں، ہمارے خیالات سے ان کے خیالات الگ، ہمارے ارادوں سے ان کے ارادے جدا،

ہمارے مشاغل سے ان کے مشاغل علیٰحدہ، ان کی امیدیں اور، خوشیاں اور، خوف اور مقصود اور۔ آگ لکڑی کو جلاتی ہے ہم بھی دیکھتے ہیں اور ان کے بھی پیش نظر ہے، لیکن ہم کیا سمجھتے ہیں، ان کے ذہن میں کیا آتا ہے۔

اول خیال تو یہ تھا کہ مرادآباد دُنیا میں ہے، اور گاؤں نہیں قصبہ ہے، لیکن حضرت کی مسجد میں ایک دوسرا عالم نظر آتا تھا، دنیاوی معاملات کا کوسوں پتہ نہ تھا، خود حضرت کی گفتار و کردار اور وہاں کے اہل قیام کے احوال سے (عام اس سے کہ وہ چند گھنٹوں کے لئے آئے ہوئے ہیں یا دو چار برس سے رہتے ہیں) یہ معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جو تعلقاتِ دنیوی سے کنارہ کر آئے ہیں، حیدرآباد کے امیر وکبیر نواب خورشید جاہ بہادر جو ۵۲/لاکھ کے معافی دار ہیں، میرے پہونچنے سے صرف ایک روز پہلے وہاں آئے تھے، مگر ان کا ذکر نہ تھا اور نہ کوئی وقعت ان کی کسی کے ذہن میں معلوم ہوتی تھی، حالانکہ کانپور اور بلہور ان کے تذکروں کی صداؤں سے گونج رہے تھے، اور ہر ایک سوسائٹی (خواہ اعلیٰ ہو یا ادنیٰ) ان کے تذکروں کو اپنے جلسوں کا دلچسپ مبحث بنائے ہوئے تھی، پھر یہ کس کا اثر تھا؟ آیا مرادآباد کے پانی کا؟ ہرگز نہیں، وہاں کی خاک کا؟ ہرگز نہیں۔ وہاں کے در و دیوار کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے ہاتھ پاؤں کا؟ ہرگز نہیں۔ حضرت کے بالوں کا؟ ہرگز نہیں۔ البتہ اس کیفیت کا اثر تھا جو حضرت کے قلب میں تھی۔ وہ کیفیت کیا تھی؟ اس سے کون واقف ہے اور کوئی کیا جانے؟ مریض کا بدن بخار سے جلتا ہے، مگر وہ سوائے اثر کے مؤثر کو نہیں جانتا۔ سبب کو تشخیص کرنا طبیب کا کام ہے، ہم بدن پر ہاتھ رکھ کر گرمی محسوس کر سکتے ہیں، مریض کو اپنا جسم گرم اور منہ کا مزہ تلخ معلوم ہوتا ہے لیکن یہ جاننا کہ یہ غلبۂ صفراء کا نتیجہ ہے، طبیب کا کام ہے۔

دوسرا خیال یہ تھا کہ خود میرا ذہن مجھ کو ذلیل سمجھتا تھا، اور ہر چند حیرت سے غور کرتا تھا لیکن کوئی وقعت اپنی میرے ذہن میں نہیں آتی تھی، دنیاوی جلسوں میں لفٹنٹ کے دربار دیکھے، رؤوسا کے مجمع دیکھے، اہل علم کی مجلسیں دیکھیں، مگر کہیں اپنے نفس کو اتنا بے

> حقیقت نہیں پایا، اپنے اعمالِ ذمیمہ پر خود نفس ملامت کرتا تھا اور اپنی بے مائیگی پر خود نفریں کن تھا، ہر شخص سے خواہ وہ کوئی ہو، اپنے تئیں کم وقعت تصور کرتا تھا، غرض کہ ایک عجیب حال تھا کہ پورا بیان میں آنا مشکل ہے۔ وہاں سے آنے پر یہ خیالات ایسے رہے جیسے کہ کسی دلچسپ خواب کا صبح کو خیال اور لطف ہوتا ہے، رفتہ رفتہ یہ کیفیت زائل ہوگئی اور چند لمحے کے بعد پھر نفس امارہ **أنا و لاغیری** اور ''ہمچو ما دیگرے نیست'' کے پھندے میں جا پھنسا، یہ خیال میرے نزدیک محض نئے اور نرالے تھے جو مدت العمر میں کسی اور جگہ کبھی نہیں پیدا ہوئے، اس سے قیاس چاہتا ہے کہ وہ جگہ بھی کچھ اور جگہوں سے نرالی تھی،،، اللہ بس باقی ہوس۔'' (تذکرۂ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی)

غور کیجئے! یہ نرالی جگہ، یہ نرالی کیفیت اور خیال! کس چیز کا اثر ہے، حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے قلب میں وہ کیفیت کہاں سے طاری ہوئی، اس کا سرچشمہ بجز تصوف کے اور کیا ہے؟ ان کو تصوف ہی نے مرصع کیا تھا، اور اس چیز کو ان کی زندگی سے نکال دیجئے تو دیکھئے کیا بچتا ہے۔

تصوف ہمارا بہت قیمتی سرمایہ ہے، ایک لازوال دولت ہے، اس راہ سے بندہ اپنے رب سے واصل ہوتا ہے، تصوف شریعت سے الگ کوئی چیز نہیں ہے، وہ شریعت کے آدمی میں رچ بس جانے کا ایک بے بدل ذریعہ ہے۔ اس کے بنیادی ارکان پانچ ہیں، (۱) صحبت شیخ، (۲) علم شریعت، (۳) ذکر کی کثرت، (۴) فکر کا التزام، (۵) اور امراضِ نفسانی کا علاج۔ ان میں کون سی چیز قابل اعتراض ہے، اور کون سی بات شریعت کے باہر ہے؟

اس سرمایہ کی حفاظت حضرت نانوتوی اور حضرت گنگوہی قدس اللہ اسرارھما کے اخلاف کی ذمہ داری ہے۔

☆☆☆☆☆